افکار کے دیئے

آل احمد سرور

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

افکار کے دیئے

آل احمد سرور

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

ایڈیشن ——— ۲۰۰۰ء
قیمت ——— ۲۰۰/۰۰

کتابت: محمد شمیم اختر قاسمی، مدہوبنی

AFKAR KEY DEEYE
By Prof. Ale Ahmad Suroor
Edition ——— 2000
Price ——— 200/-

Published by
Educational Book House
University Market
Aligarh 202 002

ایجوکیشنل بُک ہاؤس
مُسلم یُونیورسٹی مارکیٹ
علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

فہرستِ مضامین

پیش لفظ	۷
افکار کے دیئے جلاتے رہو	۹
ہم کدھر جا رہے ہیں؟	۲۳
ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے؟	۲۸
قومی وحدت کا مسئلہ	۳۳
قومی ضرورت کیا ہے؟	۳۶
ہر رنگ میں بہار کو اثبات چاہیئے	۳۹
جذباتی ہم آہنگی کیسے ہو؟	۴۱
ذہن کا دریچہ کھلا رکھیے	۴۴
چوٹی کی بات	۴۷
لال قلعے میں	۵۰
صحت مند نظریہ کیا ہے؟	۵۸
ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے	۶۱
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں	۶۴
ساہتیہ اکاڈمی کا سیمنار	۶۶
ہر چیز کی قیمت ادا کیجیے	۷۰
جنگ آزادی یا غدر	۷۳
تقریروں کا مرض	۷۵

کچھ اپنے متعلق	۷۶
ہندوستان میں رائے عامہ	۷۹
اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانہ کو ہو آئے پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یاد خدا میں	۸۲
نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی	۸۵
جوہر طبیعتوں کے دکھانے کا وقت ہے شیرو یہی تو جان لڑانے کا وقت ہے	۸۷
سادگی سے کیوں چڑتے ہو؟	۸۹
عقیدہ اور عمل	۹۲
عصری میلانات اور وقتی کارنامے	۹۵
فوری حل اور دور رس پروگرام دونوں پر نظر ضروری ہے	۹۸
کچھ بنیادی حقائق	۱۰۱
تعمیری نقطۂ نظر اور احتجاجی نقطۂ نظر	۱۰۳
یہ کیسی جمہوریت ہے؟	۱۰۵
یوم جمہوریت	۱۰۸
الکشن اور اردو	۱۱۰
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے	۱۱۳
اپنے کو دوسرے کی مدد سے پہچانو	۱۱۶
ٹیگور کی یاد میں	۱۱۸
پیر مغاں کی یاد میں	۱۲۱
اقبال کی یاد میں	۱۲۴
گورکی کی یاد میں	۱۲۹
پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا (سرسید کی یاد میں)	۱۳۲

میر ولایت حسین کی آپ بیتی ۱۳۵
اقبال اور ہم ۱۳۹
غالب اردو اور ہندوستان ۱۴۲
ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات ۱۴۵
اردو کے صاحب طرز نثر نگار (رشید احمد صدیقی) ۱۵۲
"ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی" ۱۵۸
امریکہ ۔ چند تاثرات ۱۶۱
میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟ ۱۶۳
امریکہ کا نظام ۲۰۲
امریکہ میں اردو ۲۰۶
شکاگو یونیورسٹی ۲۱۰

پیش لفظ

ہماری زبان کے اداریوں اور میرے کچھ مضامین کا ایک انتخاب "اردو تحریک" کے نام سے ہدیۂ ناظرین ہو چکا ہے۔ اب ایک اور انتخاب "افکار کے دیئے" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ ہماری زبان میں میرے اداریئے اور مضامین صرف اردو ادب سے متعلق نہیں ہوتے تھے بلکہ ادب اور زندگی، تہذیب، تعلیم، مشرق و مغرب اور علوم و فنون سے بھی متعلق ہوتے تھے۔ میں نے ان اداریوں اور مضامین میں یہ کوشش کی تھی کہ اردو میں دانش وری کے میلان کو تقویت ملے۔ اردو میں دانش وری کی روایت بہت مستحکم اور توانا نہیں رہی ہے۔ مشرق میں ویسے بھی فکر روشن اور بیدار ذہن کی کارفرمائی جتنی ہونی چاہیے اتنی نہیں ہو پائی۔ سرسید سے ہمارے یہاں دانش وری کی روایت شروع ہوتی ہے۔ زندگی کے بدلے ہوئے تقاضوں کو سمجھنا اور سمجھانا زندگی کے تسلسل و تغیر دونوں پر نظر رکھنا ہی سچی دانش وری ہے۔

"افکار کے دیئے" اس فریضے کی ادائیگی کی ایک کوشش ہے۔ "ہم کدھر جا رہے ہیں"، "ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے"، "قومی وحدت کا مسئلہ"، "ذہن کا دریچہ کھلا رکھیے"، "تقریروں کا مرض"، "عصری میلانات اور وقتی کارنامے"، "قومی حل اور دور رس پروگرام"، "اپنے آپ کو دوسروں کی مدد سے بھی پہچانو" اور "کچھ بنیادی حقائق"، جیسے عنوانات اس کوشش کو واضح کرتے ہیں۔ دانش وری سے متعلق اِن مضامین کے ساتھ ساتھ کچھ "یادیں" بھی اس جلد میں شامل ہیں۔

اگرچہ یہ اداریئے اور مضامین بہت پہلے لکھے گئے تھے لیکن میرے نزدیک ان کی معنویت اب بھی برقرار ہے۔ میں کبیر احمد جائسی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہ مضامین اور اداریئے صاف کیے تھے اور ان کا انتخاب کیا تھا۔ اب وہی انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس کے کرتا دھرتا اسد یار خاں کا ممنون ہوں جنہوں نے میرے اداریوں اور مضامین کے انتخاب کو کئی جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے اس جلد کے پروف پڑھ کر میرے بار کو ہلکا کیا۔

آل احمد سرور

سرسید نگر۔ علی گڑھ

۲۰ر فروری ۱۹۹۹ء

افکار کے دیئے جلاتے رہو

آزادی کے بعد سماج کی نئی تنظیم کی منزل آتی ہے اس نئی تنظیم میں بہت بڑی اہمیت بنیادی قدروں کی ہے ان بنیادی قدروں کا احساس کافی نہیں، ان کا اظہار بھی ضروری ہے ورنہ زندگی میں ایک دورنگی آجاتی ہے اور قول اور عمل میں تضاد شروع ہو جاتا ہے۔ ہم نے ایک سوشلسٹ سماج کے تصور اور جمہوری طریقۂ کار کو اپنایا ہے اور اس غرض سے ایک غیر مذہبی حکومت قائم کی ہے۔ سوشلسٹ سماج کے تصور میں، سوشلزم کے اصول کا علم، دوسرے سوشلسٹ ملکوں کا تجربہ اور اپنے ملک کے تاریخی حالات، ذہنی صلاحیت اور عملی استعداد کا شعور ضروری ہے۔ جمہوری طریقۂ کار کو برتنے کے لیے جمہوریت کے معنی کو سمجھنے، اس کے اوامر و نواہی کو پہچاننے اور اس کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کی کوشش ضروری ہے۔ غیر مذہبی ریاست میں مذہب کا کیا رول ہونا چاہیے؟ غیر مذہبی تصور اور لادینی تصور میں کیا فرق ہے مذاہب کے احترام اور مذاہب کے تاریخی کارنامے کو کس طرح غیر مذہبی ریاست میں فروغ دیا جاسکتا ہے۔ مذاہب کے اصولوں کا احترام اور مختلف مذہبی جماعتوں کی کشاکش، دونوں کس حد تک ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں یہ اور بہت سے سوالات جن کے بندھے ٹکے، ڈھلے ڈھلائے اور میکانیکی جواب ممکن نہیں ہیں۔ پوری قوم کو یا قوم کے سوچنے اور سمجھنے والے افراد کو ان پر اور بہت سے ایسے سوالات پر غور کرنا ہے اور ان کا تسلی بخش جواب دینا ہے اب تک صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری حکومت کے ذمّے دار کارکن ان سوالوں سے کھیلتے ہیں اور ان کے سستے اور مفید مطلب جواب دیتے ہیں۔ یہ لوگوں سے فکر نہیں تقلید چاہتے ہیں۔

دوسری سیاسی پارٹیاں طاقت حاصل کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اقتدار حاصل کرنا سب سے ضروری ہے۔ سوچ بچار تو ہوتا ہی رہے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ذہنی و اخلاقی معیار گرتا جا رہا ہے ویسے فکر کی آزادی ہے اور یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر فکر کی اِس آزادی کو کیا کریں جب ذہن منجمد اور افکار تقلیدی ہوں۔ کانگریس گاندھی جی کی اخلاقی عظمت اور نہرو کے خلوص اور پاکیزگی کے سہارے حکومت کر رہی ہے وہ سوشلسٹ سماج کی بات کرتی ہے مگر اس کے کارکنوں کا ذہن سرکاری اور دفتری ہے وہ فضا میں پھل جھڑیاں چھوڑتی ہے، رات کا اندھیرا پھُل جھڑیوں سے دور نہیں ہوتا، ہاں تاریکی کا احساس کچھ بڑھ جاتا ہے۔ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے پیچھے کوئی واضح نظامِ فکر نہیں ہے یہ ساحل دہلوی کے اس مصرعے کی یاد دلاتی ہے، ع

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

کمیونسٹ پارٹی کو ایک واضح نظام فکر ملا تھا مگر اس نے ہندوستان کی تاریخ، ماحول اور ضروریات کا بھرپور احساس پیدا نہیں کیا، وہ فرقہ واریت کو صرف سامراجی حیلہ کہہ کر اپنا دل بہلاتی رہی۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں کہیں کہیں جن سنگھ تک سے سمجھوتہ سوچا، اس نے قومی تحریکوں کو بھی روس کے اشارے پر رجعت پرستی قرار دیا اور اس طرح اپنی ذہنی غلامی واضح کر دی، اس نے مارکسزم کی شاہراہ کو ایک پٹڑی بنا دیا اور ایک نظام حیات کو طبیب کا قطعی نسخہ۔ موجودہ دور میں حریتِ فکر پیدا کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ کمیونسٹ پارٹی کا ہے اور اب ذہن کو مقیّد اور محدود کرنے میں بھی یہ دوسری سیاسی پارٹیوں سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہی ہے سوشلزم کی منزل صحیح ہے، منصوبہ بندی بہت ضروری ہے، صنعتی نظام، ملک میں رائج کیے بغیر چارہ نہیں۔ عوام کا معیارِ زندگی بڑھانا ہے مگر ملک کی کوئی سیاسی پارٹی اس کے لیے ولولہ اور خلش پیدا نہیں کر رہی ہے۔ ذات پات کے خلاف زبانی بہت کچھ کہا جاتا ہے مگر انتخاب میں کام اس سے سب لیتے ہیں، اقلیتوں کے ساتھ انصاف کی دہائی سب دیتے ہیں مگر اقلیتوں کے ساتھ سلوک اب بھی منصفانہ نہیں ہو سکا۔ ٹھوس اور پائدار کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ تماشے سب دکھاتے ہیں آزادی کے بعد جمہوریت کا تصور دس سال میں عام ہو سکتا تھا مگر اب بھی اس کے معنی اکثریت کے جبر کے ہیں۔ تعلیمی ادارے جو ذہن و فکر کا گہوارہ ہوتے، اب تک

سیاست دانوں کے کرتبوں کا شکار ہیں۔ حکومت ادب کی سرپرستی کے نام میں اپنی کلغی میں ایک طرّہ بڑھا لیتی ہے، مگر ان حالات پر توجہ نہیں کرتی جن میں ادب پروان چڑھتا ہے اور تخلیق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ وہ ڈھنڈورچی چاہتی ہے۔ ادیب سے بے نیاز ہے۔ دوسری سیاسی پارٹیاں بھی سیاسی پروپیگنڈے کو ادب کہلوانے پر مصر ہیں۔ اسی وجہ سے ادب نعرہ بندی کا شکار ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کے جذبے کی طاقت سے سب کھیلنا چاہتے ہیں۔ اس طاقت کو معیار اور ضبط و نظم کوئی نہیں دینا چاہتا۔ یہ واقعہ ہے کہ ذہنی اور فکری اعتبار سے آزادی کے دس سال بعد بھی ہم نے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا اور کچھ نئی الجھنوں میں گرفتار ہو گئے ہیں اس کی سب سے بڑی ذمّے داری برسر اقتدار پارٹی پر ہے۔ مگر دوسری پارٹیاں بھی کم و بیش مورد الزام ہیں۔

ہمارا فرض ہے کہ ہم ملک کے تمام سوچنے والوں، مخلص کارکنوں، دانش وروں، ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب لائیں اور بالآخر تمام غیر مذہبی سیاسی پارٹیوں کے قابل افراد کی ایک قومی حکومت کے لیے فضا تیار کریں۔ ہر سیاسی پارٹی میں اچھے اور مخلص اور سنجیدہ افراد موجود ہیں۔ کانگریس چونکہ سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے اس لیے گمان یہ ہے کہ اس میں ایسے لوگ زیادہ ہوں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر سیاسی پارٹی چند اچھے افراد کے باوجود بلندی کی طرف جانے کے بجائے جماعتی حیثیت سے پستی کی طرف جا رہی ہے۔ اور سستے ہتھیار استعمال کرنے لگی ہے۔ ایسی ایک حکومت کو قائم کرانے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر ذہنی اور عملی جد و جہد کی ضرورت ہے یہ ذہنی اور عملی جد و جہد ملک کے ارباب فکر، دانش ور اور ادیب ہی کر سکتے ہیں۔ ان کا فرض سب سے زیادہ ہے کیونکہ وہ قوم کا ضمیر ہیں۔ ہمیں ملک کو سستی سیاست اور شعبدہ بازی سے نکال کر گہری اور اعلیٰ سیاست کی طرف لے جانا ہے۔ ہمیں فکر و عمل کے معیار قائم کرنا ہیں۔ ہمیں قومی اخلاق کو استوار کرنا ہے۔ ہمیں اپنے وطن کو اِس ذہنی دلدل سے نکالنا ہے جس میں اسے سستی سیاست نے پھنسا دیا ہے۔ ہمیں سوال کرنے ہیں۔ اور ان کے جواب مانگنے ہیں۔ ہمیں ہندوستان کو ذہنی آزادی، مادّی خوش حالی اور اخلاقی پاکیزگی کی جنت بنانا ہے۔ ہم اسے تنکے کی طرح حالات کے بہاؤ کا شکار نہیں دیکھ سکتے۔ آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ اس کی حفاظت کے لیے چوکنے

رہیں۔ یہ حفاظت صرف فوج نہیں کرسکتی۔ ساری قوم کی مشترک قوت سے ہی اس کی حفاظت ہوسکتی ہے یہ حفاظت کسی ایک سیاسی پارٹی کا اجارہ نہیں، سارے محبانِ وطن کا فرض ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ر نومبر ۱۹۵۸ء)

۲

پچھلے ہفتے ہم نے ملک میں فکر و نظر کی بیداری کے لیے کچھ مشورے دیے تھے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس وقت خیالات میں گہرائی کی جو کمی، فکر کی حریت سے جو انحراف اور سستے نعروں کی جو کشش عام ہے اسے دور کیا جائے اور صحیح معنی میں ذہنی بیداری کے لئے فضا تیار کی جائے۔ ہم ملک کو سستی سیاسی گروہ بندی اور پارٹیوں میں اقتدار کی رسّہ کشی سے نکالنا چاہتے ہیں۔ ہم افراد کو مشین یا کٹھ پتلی نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے ذہن سے کام لیں، اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور ان صلاحیتوں سے ملک و قوم اور انسانیت کے لیے رحمت بنیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب باتوں کا سیاسی پہلو ہے اور اس پہلو سے کوئی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ مگر سیاست میں توانائی اور گہرائی اسی وقت آتی ہے جب مختلف سیاسی پارٹیوں کے پیچھے زندگی کا ایک واضح شعور تاریخ کا ایک گہرا احساس، موجودہ حالات کا پورا علم اور عمل کی ایک نمایاں صلاحیت ہوتی ہے بظاہر ہمارے ملک میں ہر چیز سیاسی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ سستی سیاست نے ہر چیز کو اسی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے یہاں حقیقی سیاست بہت کم ہے۔ اقتدار کی رسّہ کشی بہت زیادہ۔ حکومت کی گدّی سب چاہتے ہیں خونِ جگر صرف کرنا کوئی نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ سب ایسے نہیں ہیں مگر اکثریت ایسے ہی لوگوں کی ہے۔

بظاہر ہمارے یہاں بڑا سوچ بچار ہو رہا ہے اور فن کاروں اور دانش وروں کی پوچھ گچھ بھی ہے مگر ہماری ذہنی کاوش اور فکری گہرائی کا کیا حال ہے؟ کیا افراد ایمانداری سے اپنی خامیاں دیکھ لیتے ہیں کیا قومی پیمانے پر نئے خیالات، اقدار اور آدرش وجود میں آرہے ہیں؟ وہ افراد جو اپنا ذہن دوسروں کے حوالے کرنا نہیں چاہتے، جو ادبی، تہذیبی

سیاسی یا مذہبی مسائل میں اپنی رائے رکھتے ہیں، اچھی نظر سے دیکھے نہیں جاتے۔ حکومت نے کچھ قدریں بنادی ہیں۔ مخالف پارٹیوں نے ان کی مخالفت اپنا فرض سمجھ رکھا ہے۔ حکومت کو یہ اچھا نہیں معلوم دیتا کہ اس کی بنائی ہوئی قدروں پر کوئی نکتہ چینی کرے۔ نکتہ چینی سے روکنا تو مصلحت نہیں مگر نکتہ چینوں کو خبطی ٹھہرا دینا کچھ مشکل نہیں اِسی طرح مخالف پارٹیاں بڑے بڑے قومی معاملات میں اپنا عمل متعین کرتے وقت سیاسی مصلحتوں کا خیال رکھتی ہیں اس شدت کی وجہ سے ملک کا نقصان ہو رہا ہے مذہب میں جو چیز کٹھ ملّا بناتی تھی اسی نے سیاست میں کٹرپن پیدا کر دیا ہے اور ان سیاست کے ملّاؤں کے درمیان مرغی حرام نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔

آج ہمارے ملک میں رواداری کا جو فقدان ہے وہ خطرناک ہے یہ تقشّف اور کٹرپن کے سوتوں کو خشک کر رہا ہے اگر ہم مذہب میں عقلیت کے حامی ہوں تو آزاد خیال کہہ دیے جائیں اور ہمارے "ملحدانہ" خیالات پر طنز شروع ہو جائے اگر ہم ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا ذکر کریں تو ہماری قوم پرستی مشکوک ہو جائے، اگر اردو کی حمایت کریں تو ہندی کے مخالف سمجھ لیے جائیں۔ اگر انگریزی سے مرکز میں کچھ اور مدت تک کام لینے پر تیار ہوں تو یہ بات حب وطن کے منافی ٹھیرے۔ اگر غذائی صورتِ حال کے خطرناک ہونے پر احتجاج کریں تو کانگریس دشمنی کا الزام لگ جائے۔ اگر بورس پاسترناک کے ساتھ روسی حکومت کے سلوک پر یا امرے ناتھ کے انجام پر افسوس کریں تو کمیونسٹ دشمن کہلائیں۔ اگر دیوالی منائیں تو قوم پرست ٹھیریں، اگر ہلال عید کے حسن کا ذکر کریں تو لوگوں کو فرقہ واریت کی بو محسوس ہو اگر ہم کسی مشہور ادیب، سیاست داں یا قومی پیشوا کے سائے میں چلیں تو سیڑھی کے آخری زینے تک پہنچ جائیں، اگر اپنے افکار کی کڑی دھوپ میں اپنا راستہ خود بنائیں تو بگولوں کی نظر ہو جائیں۔ مزاد چودھری کا خیال ہے کہ ہمارے خیالات میں جو کٹرپن ہے وہ ہندو مذہب کا نتیجہ ہے۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام مذہبی دیوانگی سکھاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے سستا نسخہ یہ بتا دیا ہے کہ نہ مذہب ہوگا نہ یہ کٹرپن ہوگا۔ چلئے مذہب کٹرپن سکھاتا ہی تھا مگر ستی سیاست نے جو کٹرپن پیدا کیا ہے اس کی آنچ تو دیکھیے۔ جسے دیکھیے اندر ہی اندر سلگ رہا ہے۔ قومی زندگی میں سوائے داؤ پیچ، اُکھیڑ پچھاڑ کے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

ہمارے خیال میں قصور نہ مذہب کا ہے نہ سیاست کا، اصل خرابی یہ ہے کہ اوّل تو عام طور پر کسی عقیدے پر بنیاد نہیں ہے، دوسرے اس عقیدے کی خاطر خدمت اور ریاض کرنے کا ولولہ ناپید ہے، تیسرے اپنی تعمیر سے زیادہ دوسرے کی تخریب پر نظر ہے۔ اپنا گھر کوئی نہیں بناتا، دوسرے کا گھر چھیننا چاہتا ہے۔ اپنے ادب، تہذیب، تاریخ، فلسفے سے سطحی واقفیت ہے، دوسروں کے افکار کی غلامانہ تقلید ہے۔ بت گری بھی روایت ہوگئی ہے اور بت شکنی بھی۔ تنقید یا تو قصیدہ خوانی ہے یا فرد قرار دادِ جرم، ادیب اپنی تصانیف کے سہارے نہیں، دوسروں کے دیباچوں کے سہارے بڑھتا ہے، شاعر اپنی غزل سے نہیں، ساتھیوں کی تنقید سے پہچانا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اس طرح سوچتے ہیں وہ متوسط طبقے کی بھٹکی ہوئی روح کے سائے ہیں، ورنہ حقیقت تو بڑی روشن اور تابناک ہے۔ جواہر لال نہرو کے نزدیک ملک میں سب خیریت ہے اور وہ تیزی سے ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے بے شک ترقی کی طرف ہمارے قدم بڑھے ہیں مگر اسی تیزی سے خطروں کی طرف بھی۔ ہمارا امتحان یہ ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں خطروں سے کس طرح بچتے ہیں اور ہماری ترقی کس طرح پورے ملک کو آگے کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم جن اصولوں کو مانتے ہیں، ان کے حقیقی مفہوم کو ذہن میں رکھیں اور ان تصورات کو تصویر میں ڈھالیں۔ ان میں جمہوریت، غیر مذہبی ریاست اور سوشلزم کو سب سے پہلے سمجھنا ہے۔ اگلی اشاعت میں ہم ان تصورات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ ہم سچی بے اطمینانی کو سستے نشے سے زیادہ صحت مند سمجھتے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں مطلق تکلّف نہیں کہ ذہنی اعتبار سے آج ہم جس بھول بھلیّاں میں گرفتار ہیں اس سے جلد سے جلد نکلنا ہمارا فرض ہے ورنہ ہماری ترقی ایک سراب ثابت ہوگی اور ہم حالات کا ایک کھلونا ہو کر رہ جائیں گے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ ۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۵۸ء)

(۳)

ہندوستان میں جمہوری حکومت ہے۔ جمہوری حکومت کے متعلق لنکن کا یہ قول اب تک دہرایا جاتا ہے کہ یہ عوام کی حکومت ہوتی ہے، عوام کے ذریعے سے ہوتی ہے اور عوام کے لیے ہوتی ہے۔ جیسا کہ برناڈ شا نے اپنے ڈرامے "سیب کی گاڑی" میں لکھا ہے یہ ابھی تک ایک خواب ہے جو مکمل حقیقت نہیں بن سکا ہے۔ جمہوریت میں اپنے حکمراں چننے کا حق بظاہر عوام کو ہے اور وہ اپنا یہ حق استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔ مگر درحقیقت سارے عوام میں ابھی تک نہ یہ صلاحیت پیدا ہوئی ہے اور ان کا شعور اتنا گہرا ہو سکا ہے کہ وہ اپنے اس حق کا صحیح استعمال کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ اچھے معیاروں کے بجائے سستے اور اُتھلے جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان میں جمہوریت کی بنیادی شرط موجود ہے یعنی سارے بالغ شہری ووٹ دینے کا حق رکھتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ مفلسی، جہالت یا سستے جذبات کی وجہ سے وہ اپنے اس حق کا صحیح استعمال نہیں کرتے اور بعض اوقات تعصب، تنگ نظری، ذات پات، کنبے، قبیلے یا روپے کے دباؤ سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جمہوریت کو حقیقی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ سارے شہریوں کو تعلیم ملے، ان میں سماجی شعور پیدا ہو، وہ اچھے اور برے کی پرکھ خود کر سکیں، وہ ذاتی نفع کے پیمانے سے ہر چیز کو نہ ناپیں بلکہ قومی ضروریات کو ترجیح دینا سیکھیں۔ اس لیے ہر اچھی حکومت کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ وہ اپنے شہریوں کے ذہنی معیار کو بڑھائے تاکہ ان کا انتخاب بہتر ہو سکے۔ ہماری حکومت اس کی طرف توجہ ضرور کر رہی ہے مگر اس کو بنیادی اہمیت نہیں دے رہی ہے۔ اسی وجہ سے یہ اہم کام دفتری الجھنوں کی وجہ سے بڑی سستی سے ہو رہا ہے۔

جمہوریت کی بڑی شرط یہ ہے کہ سماج میں ایسے طبقے نہ ہوں جو اس پر بوجھ بن جائیں اور ان کی وجہ سے ملک کی ترقی رک جائے یعنی جمہوریت کے فروغ کے لیے ایسے اقتصادی رشتوں کی ضرورت ہے جن میں ظالم اور مظلوم، حاکم اور محکوم کا سوال ختم ہو سکے بلکہ جو پابندیاں ہوں وہ سماجی اور اخلاقی ہوں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم جمہوریت کے منافی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ سب کو ایک سی تنخواہ یا مزدوری ملے، لیکن اس کے یہ معنی ضرور ہیں کہ کم سے کم

آمدنی اور زیادہ سے زیادہ آمدنی کے فرق کو بہت زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔ اور جس میں صلاحیت یا ہنر ہو وہ ترقی کر کے اوپر پہنچ سکے۔ بظاہر سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کو آزادی ہے کہ وہ ترقی کے سب سے اونچے زینے پر پہنچ جائے مگر یہ ترقی اول تو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور دوسرے اس کی خاطر دوسروں کو پیچھے ڈھکیلنے کے لیے خاصے داؤ پیچ کرنے پڑتے ہیں اور بہت سے اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھنا ہوتا ہے اس لیے سچی جمہوریت میں فرد کی ترقی کے لیے راستے تو ہونا چاہئیں مگر وہ راستے جو سماج کی منزل کی طرف لے جاتے ہیں نہ کہ وہ سماج دشمنی سے مل جائیں۔

جمہوریت کی تیسری شرط یہ ہے کہ ہر چیز کو ختم کیا جائے خواہ وہ حکومت کے ڈنڈے کا جبر ہو یا مروجہ خیالات یا عقائد کا، یا ذات پات اور اپنے طبقے کے مفاد کا۔ اگر جمہوریت کی خاطر اس کی مشین کے کسی پرزے یا پہلو پر اعتراض کرنا ہو تو اس کی آزادی ہو۔ اور اس کی آزادیٔ خیال میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ روس میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر اظہار خیال پر پابندی بہت شدید ہے۔ کہا جاتا ہے کشمکس کے اس دور میں یہ ضروری ہے اس خیال میں کچھ صداقت ضرور ہے مگر نکتہ چینی پر برافروختہ ہونے، ایک لاٹھی سے تمام ذہنوں کو ہانکنے اور افسروں کو ادبی معیاروں کا جج بنانے کی بھی اس میں بڑی گنجائش ہے چنانچہ اکثر اس کا ثبوت بھی ملتا رہتا ہے اس لیے سچی جمہوریت میں اظہار خیال پر ایسی پابندی نہیں ہونی چاہئیے کہ حریت فکر کا گلا گھٹ جائے۔ حکومت پر اعتراض کے معنی وطن دشمنی کے نہیں ہونے چاہئیں۔ پارٹی اور ریاست میں فرق کرنا چاہئیے، ریاست کے مفاد کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیے مگر پارٹی کو ریاست نہیں سمجھنا چاہیے۔ ایک سے زیادہ سیاسی پارٹیوں کے فروغ کو جبراً نہیں روکنا چاہیئے لیکن سیاسی پارٹیوں کی مخالفت سیاسی یا جمہوری ذرائع کے مطابق ہونی چاہیے۔ اس کا فیصلہ اگر مشین گن یا گولی سے کیا گیا تو جمہوری طریقۂ کار نہ ہوگا۔

جمہوریت کے تصور میں لبرل ازم کی روح کار فرما ہے۔ کچھ لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ لبرل ازم کا دیوالیہ نکل چکا ہے اور یہ سرمایہ داری کی آڑ ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ رائے صحیح نہیں۔ لبرل ازم کے معنی انارکزم کے نہیں ہیں۔ نہ اس آزادی کے ہیں جس پر کوئی سماجی پابندی نہ ہو۔ لبرل ازم کی اصل اسپرٹ یہ ہے کہ ایمانداری سے اختلافات کے لیے

مواقع ہوں اور اس اختلاف کا احترام کیا جائے اور کسی جبر سے یا ڈر سے اپنے خیالات بدلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ لبرل ازم، تبادلۂ خیالات کو اہمیت دیتا ہے سنجیدہ بحث کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہے، ذہن کی کھڑکیاں بند نہیں کرتا۔ ہر اچھے پہلو کو قبول کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اور جہاں اسے کارفرما دیکھتا ہے اس کا اعتراف کرتا ہے۔ لبرل ازم ذہنی توازن کا دوسرا نام ہے۔ اس ذہنی توازن پر شرمانے کے بجائے فخر کرنا چاہیے۔

جمہوریت کے معنی اکثریت کے جبر کے بھی نہیں ہیں۔ جمہوریت میں فیصلہ اکثریت سے ضرور ہوتا ہے مگر اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں نہ بدل سکے تو اکثریت کا استبداد شروع ہو جاتا ہے اکثریت یا اقلیت کی بنیاد ہونا تو سیاسی چاہیے۔ مگر مذہبی لسانی بنیادوں پر جو اقلیتیں موجود ہوں، ان کے حقوق کے تحفظ اور ان کی ذہنی آسودگی کے سوال کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہر جمہوری حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہبی اقلیتوں یا لسانی اقلیتوں کو مطمئن رکھے۔ اطمینان کے معنی یہ ہیں کہ انہیں اپنی بقا اور ترقی کی طرف سے خطرہ نہ ہو اور وہ ملک کے تمام اہم اداروں میں اپنی صلاحیت کے مطابق حصہ لے سکیں۔

جمہوریت اپنی بقا کے لیے طاقت کا استعمال بھی کر سکتی ہے مگر طاقت کے استعمال میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے جسے اقتدار حاصل ہو جائے وہ اپنے کو خلاصۂ کائنات اور پوری قوم سمجھنے لگتا ہے اور جبر سے کام لینا شروع کر دیتا ہے۔ نام قومی ضروریات کا لیتا ہے اپنا اُلّو سیدھا کرتا ہے اس کے لیے سوائے قوم کے ایک بیدار ضمیر اور رائے عامہ کے ایک موثر احتساب کے اور کوئی روک نہیں۔ مقصد رواداری کے لیے فضا پیدا کرنا ہے تشدد کو ہوا دینا نہیں۔

آخر میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اپنی قومی تاریخ، ماحول اور مزاج کے احساس پر ہی جمہوریت کے لیے سازگار فضا قائم ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت ہندوستانی پس منظر میں ہی ترقی کر سکتی ہے۔ وہ دوسرے ملکوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے مگر کسی کی ہو بہو نقل نہیں ہو سکتی۔ دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانے

کے لیے ان کی غلطیوں کی نقل ضروری نہیں اور نہ اپنے آپ کو بالکل گیا گزرا سمجھنا ضروری ہے۔ عقیدے سے اعتماد پیدا ہوتا ہے اور عمل کے لیے نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ ہم لاکھ گئے گزرے سہی، پھر بھی ہمارا ایک شاندار ماضی رہا ہے ہم ایک ایسے حال سے گزر رہے ہیں جو ہمارے عزم و عمل کے لیے ایک چیلنج ہے اور ہمارا مستقبل ہماری بے پناہ ذہنی اور عملی طاقت کے صحیح استعمال کا منتظر ہے۔

(ہماری زبان علی گڑھ۔ ۲۲ نومبر ۱۹۵۸ء)

(۴)

ہماری جمہوریت غیر مذہبی ہے غیر مذہبی حکومت کے معنی عام طور پر یہ لیے جاتے ہیں کہ یہ مذہب کے خلاف ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے مذہب سے کوئی سروکار نہیں۔ مذہب کے معاملے میں یہ قطعی غیر جانب دار ہے سیاسی مسائل کا حل مذہبی بنیادوں پر نہیں کرتی مذہبی جذبات سے نہیں کھیلتی، مذاہب کے اختلاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے سب کو برابر کا درجہ دیتی ہے، کسی خاص مذہب کو مقدم نہیں ٹھیراتی۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ مذاہب کی تبلیغ کو ممنوع قرار دیتی ہے یا صرف لامذہبیت کے پرچار کو ضروری سمجھتی ہے۔ جیسا کہ روس میں ہے۔ بلکہ سیاسی کاموں میں مذہبی نقطۂ نظر کے بجائے ریاست اور قوم کی دنیوی ضروریات کا لحاظ رکھتی ہے۔ ہندوستان ہمیشہ سے مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی یہاں ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، بدھ، جینی، سکھ اور لامذہب اشخاص موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندو یہاں اکثریت میں ہیں مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلمان یا پارسی یا عیسائی ہندو مذہب اختیار کر لیں یا کسی معاملے میں اس مذہب کے ماننے والوں کا جبر محسوس کریں۔ ہندو مذہب کا احترام جس طرح دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر فرض ہے اسی طرح دوسرے مذاہب کا احترام ہندوؤں پر فرض ہے۔ احترام کے معنی یہ نہیں کہ سب مذہب یکساں صداقت کے حامل ہیں ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کی صداقت کا سب سے زیادہ ماننے والا ہو اور اپنے اس عقیدے کا اظہار کر سکے، اور دوسروں کو اپنا

ہم خیال بنا سکے۔ اور کسی کو یہ حق نہیں کہ دوسرے پر جبر کر کے اس سے اپنی بات منوا لے۔ اسی طرح جو شخص سرے سے مذہب کو نہیں مانتا اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا آزادی سے اظہار کر سکے اور لوگوں کو اپنی طرف بلا سکے۔ گویا مذہبی معاملات میں رواداری ہماری جمہوریت کا بنیادی ستون ہے اور اس کے لیے تنگ نظری، تعصب، فرقہ بندی سے بلند ہونا ضروری ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب آدرشی باتیں ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے اور اقلیتیں اکثریت کے جبر سے آزاد نہیں ہو سکتیں۔ یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت پر اور اپنے خیال کی صداقت پر ہمارا عقیدہ نہیں ہے۔ نہ ہمارے کردار میں اتنی مضبوطی ہے کہ اپنی پسندیدہ قدروں کی خاطر ہم زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ تصور میں بڑی طاقت ہوتی ہے یہ برابر تصویر میں ڈھلتا رہتا ہے اگر ہم ایک مذہبی ریاست ہوتے تو مذہبی جبر سے آزاد ہونا ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا۔ یہ آزادی صرف غیر مذہبی جمہوریت میں ہی ممکن ہے۔ ہاں ظاہر ہے کہ قوم کا جو ذہنی معیار ہوتا ہے اس کے نظام اخلاق کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے ابھی ملک میں مذہبی رواداری سطحی ہے، دلوں میں گر نہیں ہیں، ذہنوں میں جالے ہیں۔ جذبات میں تندی و تیزی ہے۔ زبان پر قابو نہیں ہے۔ شخصیتیں صحت مند نہیں ہیں، پچھلی تاریخ غلط یاد ہے اس کی غلط کاریوں کا احساس ہے، اس کے مثبت اور مفید میلانات دلوں میں جاگزیں نہیں۔ اس باب میں سب برابر کے گنہگار ہیں۔ سب سے غلطیاں ہوئی ہیں لیکن قدرتی بات ہے کہ جو گروہ اکثریت میں ہے اس پر ذمے داری زیادہ آتی ہے وہ اگر صحت مند میلان اختیار کرتا ہے تو اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اقلیت میں کچھ خوف، کچھ شبہ غلط بھی ہو تو قدرتی ہے۔ ہاں اقلیت کے ذہن میں کجی نہیں ہونی چاہیے۔ اسے بے دھڑک ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اپنی جگہ لینے اور اس سماج کو مجموعی طور پر متاثر کرنے کے مبارک کام میں لگ جانا چاہیے۔ جو لوگ نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان جب تک مذہب کو خیرباد نہ کہہ دے وہ ترقی کے بام پر نہیں پہنچ سکتا وہ بڑی غلطی پر ہیں، انہیں مذہب کی طاقت کا علم نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ وہ اخلاق جو

مذہب عطا کرتا ہے دنیا کے کس قدر کام آسکتا ہے۔ ہندوستان کی ترقی لامذہبیت میں نہیں، مذہبی رواداری میں مضمر ہے۔ اس لیے اپنے مذہب پر ایمان یا لامذہبیت پر عقید سے کے علاوہ دوسرے مذاہب کا احترام محض زبان سے نہیں دل سے ضروری ہے۔ اور مذہبی جذبات سے چڑنا اسے دقیانوسیت ٹھیرانا غلط ہے اس کے لئے دوسروں کے اقدام کا منتظر رہنا بھی نامناسب ہے۔ جمہوریت میں ہر فرد پہل کرتا ہے تب اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ دوسرے سے اچھے سلوک کا متوقع ہو۔ یہ کام ایک دن میں نہیں ہوگا۔ مگر اس کام کا آغاز ہر وقت ہوسکتا ہے ہماری غیر مذہبی ریاست میں مذہب کو طاق نسیاں کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں جو روحانی تسکین، خدمتِ خلق، اور اخلاقی پاکیزگی کے جوہر ہیں انہیں ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہاں اس کی کسی مخصوص تعبیر کی خاطر دوسروں کی تعبیروں اور تفسیروں پر جھگڑنے کا ہمیں حق نہیں پہنچتا۔ ہمیں صرف اپنے خیالات کی سنجیدگی سے اشاعت کا حق ہے تاکہ دوسروں کو اپنے دلائل کے وزن سے اور اپنے عمل سے اپنا ہم خیال بنا سکیں۔ غیر مذہبی ریاست کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مذہب دشمن ہو، وہ مذہب کے ایک بلند اور پاکیزہ تصور کی خاطر، اُسے رسم ورواج کے دائرے سے نکال کر تمام انسانوں کے لیے فصل کے بجائے وصل کا پیامبر بنا سکتی ہے غیر مذہبی ریاست کے متعلق جب تک یہ شعور عام نہ ہوگا اس وقت تک ہماری مشکلات ختم نہ ہوں۔ ابھی تو یہ شعور چند لوگوں میں پیدا ہوا ہے، ابھی تو اس کرن کو سورج بننا ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ یکم دسمبر ۱۹۵۸ء)

(۵)

مارکس اور انیگلز نے ۱۸۴۸ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو شائع کیا جس میں تاریخ کی ایک نئی تعبیر کی گئی اور اقتصادی رشتوں اور ان کی کش مکش کو بنیادی اہمیت دی گئی۔ سوشلزم کا ایک رومانی اور جذباتی تصور مارکس سے پہلے بھی موجود تھا۔ مگر اس کا سائنسی اور مادّی، منطقی اور تاریخی تصور مارکس نے پیش کیا۔ مارکس کے خیالات کا پورے یورپ پر گہرا اثر ہوا مگر وہ انقلاب جس کی پیشین گوئی مارکس نے کی تھی جرمنی جیسے صنعتی ملک میں نہیں روس

جیسے زرعی ملک میں رونما ہوا۔ مارکس کے خیال کے مطابق سرمایہ داری کا عروج اجارہ داری میں اور اجارہ داری کی انتہا، بالآخر سوشلزم میں ظاہر ہوتی ہے روس میں جو انقلاب ہوا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کی چیرہ دستیوں نے روسی عوام کو حکمراں طبقے سے بدظن کر دیا تھا اور اقتدار کے لئے مختلف جماعتوں میں جو کش مکش ہوئی اس میں لینن کی فراست اور عملی صلاحیت کی وجہ سے بالشویک عناصر بالآخر فتحیاب ہوئے۔ مارکس نے تاریخ اور ارتقا کا جو تصور پیش کیا ہے وہ بڑا وزن رکھتا ہے لیکن اسے حرفِ آخر سمجھنا غلط ہوگا۔ اسی طرح سوشلزم کی جو شکل روس میں کامیاب ہوئی ہے اس کے ہر جز پر اصرار بھی مناسب نہیں۔ مارکسزم ایک تصور ہے۔ اس تصور کو ایک نسخہ یا فارمولا سمجھنا صحیح نہ ہوگا۔ مارکس نے ایک ایسے سماج پر زور دیا تھا جو قطعی غیر طبقاتی ہوگا اور جس میں حکومت یا ریاست ختم ہو جائے گی۔ اس نے پرولتاری آمریت کو عبوری قرار دیا تھا۔ حالانکہ روس میں چالیس سال کے اشتراکیت کے تجربے نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ پرولتاری آمریت آسانی سے ختم نہیں ہوتی اور اس میں اگر اسٹالن جیسے اشخاص برسرِ اقتدار آجائیں تو وہ ہر قسم کے ظلم و جبر سے اپنی گدّی کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اس لیے مارکس کے خیالات کی قدر کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ روس کے ہر اقدام کو صحیح مان لیا جائے یا چین کے ہر مسئلے میں تقلید کی جائے۔ سوشلزم اب دنیا کا مقدر بن چکا ہے، مگر سوشلزم کی تصویر ہر ملک میں وہاں کے حالات، مزاج اور تاریخ کے مطابق ہوگی اس سوشلزم کے لیے ہندوستانی قومیت سازگار ہے قومیت بالائی طبقے کو جو طاقت دیتی ہے وہ ہندوستان میں اسی وجہ سے زیادہ موثر نہیں ہو سکتی کہ جمہوری نظام نے اصل طاقت یہاں کے عوام کو عطا کر رکھی ہے پھر ہندوستان کا سرمایہ دار جو اس قومیت سے اپنے لئے فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے، من مانی نہیں کر سکتا وہ پارلیمنٹ کی نگرانی اور احتساب سے بچ کر نہیں جا سکتا، وہ اپنے نفع کی خاطر عوام پر تشدد نہیں کر سکتا۔ اس لیے سوشلسٹ سماج کے نفاذ کے لیے لازمی نہیں ہے کہ انقلاب کے راستے آئے۔ وہ ارتقا کے راستے سے بھی آسکتا ہے اس کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ مذہب سے سرے سے انکار کر دے۔ مذہب کے معاملے میں

قطعی غیر جانب دار بھی رہ سکتا ہے ہندوستانی سماج کا بیشتر حصّہ دیہات میں رہتا ہے اس لیے یہاں صنعتی تبدیلی کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ گھریلو صنعتیں ختم ہو جائیں اور سارے راستے شہر کی طرف لے جائیں بلکہ اس کے معنی گھریلو صنعتوں کے گرد قصبوں کی تعمیر کے ہوں گے جن کے اردگرد شہروں کا صنعتی ماحول ہوگا۔ جیسے جیسے یہاں جمہوری فضا استوار ہوتی جائے گی ویسے ویسے جمہوری طریقے عام ہوں گے مگر جمہوریت کے معنی سرمایہ دار کی مطلق العنانی کے نہ ہوں گے نہ محض ایک نرم سرمایہ داری کے ہوں گے۔ بلکہ رفتہ رفتہ شخصی صنعتوں کے بجائے قومی صنعتی ادارے ترقی کرتے جائیں گے۔ منصوبہ بندی کی اس سوشلسٹ سماج میں بنیادی اہمیت ہوگی مگر اس منصوبہ بندی کو اور جامع اور ہمہ گیر ہونا پڑے گا تاکہ تعلیمی، تہذیبی اور سماجی ضروریات قرار واقعی پوری ہو سکیں پھر یہاں کی سیاسی پارٹیوں کو جمہوری طریقہ کار کے مطابق ایک دوسرے کا پرامن مقابلہ کر کے، اپنی خوبی کا ثبوت دینا ہوگا۔ اس کے لیے باوجود بعض ابتدائی غلطیوں کے اچھی فضا پیدا ہو رہی ہے۔ کیرالہ میں جو حکومت قائم ہوئی ہے، اگر وہ کامیاب ہوتی ہے تو یہ ملک کے لیے مفید ہی ہوگا۔ کیونکہ اس طرح ہندوستانی جمہوریت کی طاقت واضح ہوگی اور انقلاب کے لیے تشدد کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ تشدد جتنے مسائل حل کرتا ہے اس سے زیادہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے ہندوستان میں ایک پرامن، روادار اور ارتقا پسند سوشلسٹ سماج کے استحکام میں مدد کرنا ہر سچے ہندوستانی کا فرض ہے اس میں اقلیتوں کی تسکین اور آسودگی کا سامان ہے اور اس میں ہر قومی زبان کے پھلنے پھولنے کے امکانات مضمر ہیں۔ اس سماج میں اقلیتوں کے رول پر ہم اگلے شمارے میں روشنی ڈالیں گے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ دسمبر ۱۹۵۸ء)

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

کل ہی کلکتے کے ایک اردو روزنامے کے ایڈیٹر سے بات ہو رہی تھی ہم نے ان سے پوچھا کہ کلکتے میں آئے دن ہنگامے، فساد کیوں ہوتے ہیں ؟ انہوں نے بتلایا کہ کلکتہ کتنا بڑھ گیا ہے اس کا باہر کے لوگوں کو اندازہ نہیں وہاں کے لاکھوں باشندے بسوں میں لٹکے ہوئے سفر کرتے ہیں انہیں کبھی بیٹھنے کا موقع نہیں ملا، گرانی بے روزگاری نے یہ حال کر رکھا ہے۔ ہر شخص ایک تناؤ ایک جھلاہٹ محسوس کرتا ہے ایسے میں کوئی بات ہو اس کا ردعمل بہت شدید ہوتا ہے اور اکثر نیتا لوگ عوام کی اس جھلاہٹ سے فائدہ اٹھا کر ان کا رخ کسی طرف موڑ دیتے ہیں۔ پھر وہ کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی جذباتی باتیں ہوتی ہیں انہیں پہاڑ بنا کر دکھایا جاتا ہے پھر وہ واقعی پہاڑ نظر آنے لگتی ہیں۔

یہ بات کلکتے کے متعلق نہیں تمام بڑے شہروں کے متعلق بلکہ کسی نہ کسی طرح سارے ملک کے لیے صحیح ہے۔ آبادی بڑھتی جاتی ہے غذا مہنگی ہوتی جاتی ہے۔ ملک میں ترقی ہو رہی ہے مگر اس کا فائدہ عوام کو کم محسوس ہو پاتا ہے۔ تھوڑے سے لوگ بہت مزے میں ہیں۔ خوب روپیہ کماتے ہیں خوب عیش کرتے ہیں ان کے لیے دنیا کی ہر چیز مہیا ہے بہت سے لوگ جو پہلے توقعات نہیں رکھتے تھے اب آزادی کے خوابوں اور لیڈروں کے وعدوں کی وجہ سے جمہوری حکومت سے جائز توقعات رکھتے ہیں، وہ پوری نہیں ہوتیں، اچھی تعلیم گراں ہے حکومت کی طرف سے جو تعلیم دی جاتی ہے، عام طور پر بہت سطحی اور فضول قسم کی

ہوتی ہے۔ متوسط طبقہ اچھی تعلیم کے لیے اچھے پرائیوٹ اسکولوں کیطرف دیکھتا ہے اور وہاں کی فیسوں کے بوجھ تلے دبا جاتا ہے۔ مزدور کو مزدوری پہلے سے زیادہ ملتی ہے مگر گرانی بھی تو ہوش ربا ہے۔ کسانوں کے دو طبقے ہو گئے ہیں ایک بہت خوش حال ہے اور بیوی کے لیے سونے کے زیور بنواتا ہے اور اپنے لیے ریڈیو خریدتا ہے دوسرا ایک حال کے جائزہ کے مطابق ایک روپیہ روز سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ اس کی آمدنی ہی اس سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نوجوان دیکھتے ہیں کہ تعلیم کے بعد بھی بے روزگاری کے بھوت کا سامنا ہے۔ سیاسی پارٹیوں نے اب تک جو مظاہرہ کیا ہے وہ کسی طرح قابل تعریف نہیں۔ برسر اقتدار پارٹیوں کا قصور بہت زیادہ ہے۔ مگر الزام سب پر آتا ہے اس لیے کہ جسے اقتدار ملا اس نے اپنے وعدے بڑی حد تک فراموش کر دیے۔ افسر فرعون ہو گئے ہیں، سپاہی کوتوال، کلرک بادشاہ اور وزیر خداوند۔ یونیورسٹیاں جو علم کا گہوارہ سمجھی جاتی تھیں طلبا کی کثرت کی وجہ سے اپنے فرض کو پورا نہیں کر سکتیں اساتذہ مجموعی طور پر تعلیم و تدریس کے فرائض سے زیادہ اپنے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ طلبا تعلیم سے زیادہ سیاست کے چکر میں گرفتار رہتے ہیں پرانی اخلاقی قیود ٹوٹ رہی ہیں۔ مخلوط تعلیم نے بھی نئے نئے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اخلاق کے لیے کوڑا ہی ضروری سمجھا جاتا تھا، ذہنی تربیت کا کسی کو خیال نہ تھا، کوڑا بیکار ہو گیا ہے اور ذہنی تربیت دینے والے والدین خود اپنے ذاتی اغراض کے چکر میں گرفتار ہیں۔ ان حالات میں خدا جانے ہمارے ملک کا کیا ہوگا؟

کاش ہمارے وزیر ہر قسم کی تقریریں کرنا بند کر دیں، اپنا سارا وقت اپنی وزارت کی دیکھ بھال میں صرف کریں۔ کاش قوم میں زیادہ باتیں کرنا جرم قرار دے دیا جائے۔ کاش ہر شخص ہفتے میں ایک دن گاندھی جی کی طرح خاموش رہے تاکہ اسے خاموشی کی عادت پڑے۔ پھر یہ توانائی جو فضول باتوں، رسمی تقریروں اور قصیدوں یا مرثیوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ کسی سنجیدہ کام میں لگائی جا سکے۔ کاش رہ نمارہ نمائی کرنے کی جرأت کریں۔ محض عوام کے جذباتی ہیجان کے پیچھے پیچھے نہ چلیں کاش دانشور اقتدار کا جزو بننے کے بجائے اختلاف اور آزادی رائے کو حسب ضرورت شعار بنائیں اور مسائل کے عقلی و معروضی مطالعے پر زور دیں کاش میسور، مہاراشٹر، کرشنا گوداوری، بلیا اور بہار، چنڈی گڑھ کے چھوٹے

چھوٹے جھگڑوں کے بجائے ملک کے بنیادی مسائل کا درد دلوں میں پیدا ہو سکے۔ یہ ہو سکتا ہے مگر کرنے والے بھی تو ہوں۔ ہمارا ہندوستان بہت بڑا ہے اس کی بڑی تقدیر ہے اس کے لیے بڑی شاندار منزل ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندوستانیوں نے سب باتوں کا لحاظ رکھا ہے ملک کا اور اس کی کثیر آبادی کا نہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہر شخص اپنے فرض کو پہچانے اور صرف حقوق طلب کرنے کے بجائے، جو اس پر فرض عائد ہوتا ہے اس کا حق ادا کرے ہمارے مسائل جلد حل نہیں ہوں گے۔ مگر ان کے حل کی طرف ہمیں جلد از جلد بڑھنا تو چاہیے۔ اس وقت تو سبھی تنکے کی طرح حالات کے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ ہم اپنا کام نہ کرنے کا جواز اس طرح نکال لیتے ہیں کہ فلاں ہم سے کم کام کرتا ہے کاش کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں جو صرف اس پر فخر کر سکیں کہ کوئی کچھ کرے یا نہ کرے ہمیں اس کی پروا نہیں، ہم تو اپنا فرض ایمانداری سے ادا کر رہے ہیں۔

حال ہی میں ہمیں حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ جہاں اس وقت تلنگانہ کے علاقہ کو آندھرا سے الگ کرانے کے لیے ایک عوامی تحریک چل رہی ہے۔ یہ تحریک بہت معنی خیز ہے۔ کسی ممتاز سیاسی پارٹی نے اس کی کھلم کھلا قیادت نہیں کی ہے۔ مگر یہ احساس عام ہے کہ تلنگانہ کے علاقے کے ساتھ انصاف نہیں ہوا خصوصاً چھوٹی ملازمتوں میں، گوداوری کے پانی کے معاملے میں، علاقے کی بچت کے خرچ کرنے میں، چھوٹے ملازموں کے لیے مکان بنانے میں اور ایسے ہی بہت سے معاملات میں آندھرا کے لوگوں نے تلنگانہ کے علاقہ کے لوگوں کے حقوق کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ طلبا اس تحریک میں پیش پیش ہیں۔ وہی توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ وہی پتھر برساتے ہیں، وہی پولس کی گولی اور لاٹھی کھا رہے ہیں۔ دیکھیے اس معاملہ کا کیا فیصلہ ہوتا ہے وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ حکومت ہند کو تلنگانہ کے ساتھ زیادتی کا احساس ہے مگر تلنگانہ علیٰحدہ ہوا تو ودربھ اور پھر سوراشٹر کو بھی علیٰحدہ کرنا پڑے گا۔ یہ مثال اس لیے دی گئی کہ اوّل تو نئی نسل ہر جگہ بے چین ہے اور وہ یہ سمجھتی ہے کہ معقولیت سے اور خاموش احتجاج سے اور جلسوں اور قرار دادوں سے کچھ نہ ہوگا۔ بلکہ جب تک دباؤ نہ پڑے گا حکومت

نہ جھکے گی اور ذرا دباؤ پڑا تو فوراً جھک جائے گی۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو یہ حکومت اور عوام کے لیے کوئی اچھی بات نہیں۔ نوجوانوں کی برہمی چاہے کتنی ہی بڑھی ہوئی ہو اس کے پیچھے کچھ سیاسی وسماجی اسباب ہیں۔ ان کے بڑوں نے انہیں عام طور پر دھوکا دیا ہے، ملک کی آزادی کو اکیس سال ہو گئے آزادی کی وجہ سے لوگوں کی توقعات قدرتی طور پر بڑھیں، مگر وہ کتنی پوری ہوئیں ہیں۔ ملک کی آمدنی بڑھی۔ اس سے سب سے زیادہ فائدہ کس نے اٹھایا۔ تعلیم بڑھی تو بے روزگاری بھی بڑھی۔ غلے کی پیداوار بڑھی مگر قیمتیں کم نہ ہوئیں، ٹیکس بھی بڑھ گیا ہے، ریلوں میں سڑکوں پر، شہروں میں، گلی کوچوں میں ہجوم بڑھ گیا ہے۔ قانون سب کے لیے یکساں نہیں، کچھ لوگ بڑے مزے میں ہیں، ان کے پاس روپیے کی ریل پیل ہے زیادہ تر لوگ بڑی مشکل سے زندگی کے دن گزارتے ہیں ان سب باتوں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تبدیلی کی خواہش حالات کو بہتر بنانے کی خواہش قدرتی ہے۔ یہ تبدیلی لازمی ہے اس کی رفتار کو روکا نہیں جا سکتا جو لوگ ہر قسم کی تبدیلی کے خلاف ہیں اور تیس چالیس برس پہلے کے زمانے کو یاد کرتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں، وہ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے اس تبدیلی کی ضرورت کو محسوس کرنا ہوگا پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر وہ تبدیلی جو آج ضروری ہے کل پر اٹھا رکھی گئی تو پرسوں اس سے زیادہ شدید تبدیلی ہوگی جس میں وہ بھی ختم ہو جائے گا جو آج باقی رکھا جا سکتا تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ قومی خدمت کے دعوے اور ذاتی مفاد کا فریب اب نہیں چل سکتا۔ چوتھی بات یہ ہے کہ جمہوریت ایک دودھاری تلوار ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اصولوں پر چلنے میں سب کے نفع نقصان میں شریک ہونا پڑتا ہے اور افسر اور ماتحت سب کو ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں، پانچویں بات یہ ہے کہ عام تعلیم کے علاوہ جتنی پیشوں کی تعلیم ہے اس کا براہ راست تعلق روزگار سے ہونا چاہیے، ہر نوجوان جسے کسی پیشے یا صنعت کی تعلیم ملتی ہے اسے روزگار بھی ملنا چاہیے۔ چھٹی بات یہ ہے کہ فرقہ واریت، ذات پات، علاقائیت، لسانی یا سداری جیسی لعنتیں اس وقت ختم ہو سکتی ہیں جب ہر سطح پر اور ہر درجہ پر انکا خاتمہ ہو۔ دوسرے کو نصیحت کرنا اور خود اپنے عمل سے کچھ اور کرنا، یہ مرض دور ہونا چاہیے،

آخری بات یہ ہے کہ سوشلزم کی منزل کے ساتھ بڑے سرمایہ داروں کو پوری چھوٹ دینا کسی طرح جائز نہیں اور پبلک سکٹر کو سفید ہاتھی کی طرح رکھنا خطرناک ہے۔ ہندوستان کی سیاست بڑی حد تک اقتدار حاصل کرنے کی سیاست ہے، خدمت کی سیاست نہیں، پھر ہندوستان ایک وفاقی ریاست ہے۔ وفاقی ریاست کے معنی یہ ہیں کہ ریاستوں کو اندرونی معاملات میں اور زیادہ اختیار دینا پڑے گا اور مرکز میں ایک پارٹی کی اور ریاستوں میں دوسری پارٹیوں کی حکومتیں ایک دوسرے سے تعاون کر سکتی ہیں ہاں ملک کی سالمیت اور اس کی وحدت پر سب کو اصرار کرنا ہوگا وحدت کو مان کر چلیے تو اس وحدت میں کثرت کا اصول بھی ماننا پڑے گا اور اس طرح ایک بڑے ملک کی یک جہتی اور اس کی رنگا رنگ تہذیب کو ملحوظ رکھنا اور اسے ترقی دینا آسان ہوگا۔ گویا ہمیں ہم سب کے لیے اور سب ہمارے لیے کا سبق سیکھنا ہے۔

ہمارا ادب کدھر جا رہا ہے؟

آزادی کے بعد جو واقعات پیش آئے ان سے ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا متاثر ہونا قدرتی تھا۔ چنانچہ خیالی پلاؤ کے بجائے اُبالی کھچڑی اور بے نمک سالن کی بھرمار شروع ہو گئی۔ تقسیم نے دلوں کو جس طرح مجروح کیا تھا اس کے نتیجے میں دلوں کی جراحت کے چمن کھلائے گئے، فسادات کا بیان، ان کا تجزیہ، اصلی مجرم کی تلاش، دلوں کے چور دریافت کرنے کی کوشش، خوابوں کے آبگینوں کی شکست اور حقائق کی سنگینی کا ہیبت ناک احساس، عام ہوا۔ بارے جو آگ بھڑک رہی تھی وہ بجھنی شروع ہوئی۔ سیاسی دستاویزیں، صحافتی صحیفے کم ہوئے، تجربے کی گہرائی اور گیرائی، تخیل کی کارفرمائی، حسن کاری کے احساس کا مطالعہ شروع ہوا۔ اور ہمیں خوشی ہے کہ اب شاعر اور ادیب سے زندگی کی عکاسی کا مطالبہ، فوٹو گرافی کا مطالبہ نہیں رنگوں اور خطوط کی اس حقیقت کا مطالبہ ہے جو شاعر اور ادیب کی بصیرت، تجربے، نظر اور جمالیاتی احساس کی ترجمان ہوتی ہے۔

شاعر اور ادیب کی یہ بصیرت ہمیں کیا دے سکتی ہے اور کیا نہیں۔ یہ ہمارے ہاتھ میں تلوار نہیں دے سکتی ہاں ذہنی تلوار دے سکتی ہے۔ ہمارا شاعر اور ادیب ادب کی خاطر کسی خیالی دنیا میں پناہ نہیں لے سکتا۔ نہ وہ اس مقدس کام کے بہانے روزمرہ زندگی کے تقاضوں سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔ اسے تند جبیں ہونے کا حق نہیں، ادیب اور شاعر ہمالہ کی چوٹی پر بیٹھ کر کسانوں، مزدوروں اور کلرکوں کو حقارت سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ انہیں میں سے ہے۔ ہاں اس کا کام ان سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی، سب کا کام ہے وہ "دیدۂ بینائے قوم" ہے مگر اس کے لیے صرف آنسوؤں کے

دریا بہاتے رہنا کافی نہیں، اسے اپنی آنکھوں سے بدلتے ہوئے ہندوستان کو دیکھنا ہے۔ اس تہذیبی، معاشرتی، سیاسی کشمکش میں حصّہ لینا ہے جو ہماری بساط پر ہو رہی ہے وہ بھی پابند ہے مگر اس کی پابندی دوسروں سے زیادہ ہے وہ سماجی رشتوں کے علاوہ فن کے تقاضوں کا بھی پابند ہے یہ فن جامد نہیں ترقی پذیر ہے مگر اس میں تسلسل کا احساس ضروری ہے خیال کی بھول بھلیاں میں راستہ ماضی کے عرفاں سے بھی ملتا ہے۔

ہمارے ادب میں سماجی رشتوں کا احساس تو عام ہے مگر ان کی نوعیت کا احساس واضح نہیں۔ ادیب اور شاعر کی وہ آزادی جو انسانیت کے ایک جامع تصور کے ساتھ ہے جو ادب کو نہ محض سیاست کا کھلونا بنانے پر قانع ہے نہ مذہبی احکام کی شرح، ایسی آزادی ہے جس کے لیے ہمیں اصرار کرنا چاہیے۔ ادیب اور شاعر اگر اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا احساس رکھتے ہیں تو انہیں حق ہے کہ اپنے سماج اور حکومت پر نکتہ چینی کریں اس کی انہیں آزادی ہونی چاہیے اور جو سماج انہیں اس کی آزادی نہیں دیتا وہ صحت بخش نہیں۔ ادیب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لکیر کا فقیر نہ ہو اور نہ ضد میں آ کر بے لگام ہو جائے۔ وہ صنعتی زندگی کے خطرے کا احساس رکھتے ہوئے مشین کا دشمن نہ بن جائے۔ مشین، احساس پر جو اثر ڈالتی ہے ذہن کو پرواز سے جس طرح روکتی ہے سستی یکسانیت اور ادنیٰ تفریح کی طرف جس طرح میلان پیدا کرتی ہے اسے سمجھتے ہوئے اس کی دی ہوئی برکتوں سے انکار نہ کرے۔ مشین کی غلامی کے بجائے مشین پر قابو رکھے۔ فلم اور ریڈیو کی حد بندیوں کو سمجھے اور اس کی مروجہ قدروں کا پابند نہ ہو۔ بلکہ انہیں قدریں دے سکے۔ سرد عقلیت سے کام لینے کے بجائے پرسوز شخصیت کا اثر ڈالے۔ اردو ادب، نہ صرف اپنی دنیا کی بلکہ پورے ہندوستان کی ذہنی قیادت کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ادب صرف لکھنے والے کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ پڑھنے والے کی ضرورت اور صلاحیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی پیش کرے۔ لکھنا پڑھنا دونوں ایک بڑی "باشعور ترجمانی" کے دو جز ہیں کیا ہم اس باشعور ترجمانی کا حق ادا کر رہے ہیں یا صرف حالات کے غلام ہیں اور جو گزرتی ہے اسے بیان کرنے پر قانع ہیں کیا ہم پڑھنے والوں کے مذاق کے ترجمان ہیں یا ان کی ضروریات کو

سمجھتے ہوئے ان کے ذہن کو آسودگی، ان کے خیالات کو وسعت اور ان کے جذبات کو حرارت دے سکتے ہیں۔ اس مسئلے کی وضاحت آئندہ اشاعت میں کی جائے گی۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۵۷ء)

(۲)

لکھنے والے کیوں لکھتے ہیں؟ یہ سوال بار ہا کیا گیا ہے اور اس کے مختلف جواب دیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ میں اپنی آسودگی کے لیے لکھتا ہوں۔ کوئی سماج کی ذہنی قیادت کے لیے قلم ہاتھ میں لیتا ہے کوئی اس لیے لکھتا ہے کہ اسے لکھنے میں لطف آتا ہے کوئی بقول ڈاکٹر جانسن کے پیسوں کے لیے لکھتا ہے یہ سب جواب علیحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی پوری حقیقت کو بیان نہیں کرتے۔ احساس، اظہار پر اور اظہار ترجمانی پر مجبور ہوتا ہے جتنا ہی باشعور اور بھرپور احساس ہوگا اتنا ہی اظہار میں سلیقہ ہوگا اور اظہار میں سلیقے کے بغیر ترجمانی یا ترسیل مکمل نہیں ہوتی جن لکھنے والوں کا احساس من کی موج سے آگے نہیں بڑھتا ان کے اظہار میں بھی مد و جزر ہوگا اور اس اظہار کے اعلان میں بھی پیچ و خم آجائیں گے جو لوگ صرف پیسے کمانے کے لیے لکھتے ہیں خواہ وہ اخبار کے لیے لکھیں یا کسی ادارے کے لیے یا فلم کے لیے۔ وہ حالات کے غلام ہو جاتے ہیں، ان کی حیثیت ان ہنرمندوں کی سی ہے جنہیں اپنے ہنر کو بازار کی ضرورت کے سانچے میں ڈھالنا ہے اور بس۔ لیکن مہذب انسان بازار کی ضرورت کے سہارے پر نہیں جیتا، وہ ان تہذیبی قدروں کی خاطر جو اسے عزیز ہیں اور جو انسانیت کا قابل قدر سرمایہ ہیں اپنے قلم سے ایک جہاد کرتا ہے اس جہاد میں صرف اسے اپنی بات کہہ کر سبکدوش ہو جانا نہیں ہے بلکہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا ہے دوسروں کے میلان کو دیکھتے ہوئے اپنی بات اس طرح کہنی ہے کہ وہ رائگاں نہ جائے۔ محض خشک وعظ و پند نہ ہو جائے صدا بصحرا ثابت نہ ہو بلکہ بقول سرسید "دلوں سے نکل کر دلوں میں بیٹھ جائے"

اس لیے لکھنے والے کو اس انفرادیت سے بچنا چاہیے۔ جو یا تو رومانیت کی طرف

لے جاتی ہے یا مریض اشاریت کی طرف یا نراج کی طرف۔ اچھا لکھنے والا کبھی اپنے حلقے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ اس پر قناعت کر سکتا ہے کہ چند مخصوص اہل نظر حضرات ہی اس کی بات سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی بات تہہ دار ہو اس کے کچھ پہلو سب پر واضح ہو جائیں لیکن کچھ پہلو صرف خواص کے لیے ہوں یہ بات کسی طرح بری نہیں مگر اسے بہ حیثیت مجموعی زیادہ سے زیادہ ترسیل یا ابلاغ کی کوشش کرنا ہے۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ لکھنے والے کو اس بات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیے کہ اس کی بات میں وزن اور اس کے اظہار میں سلیقہ ہو لوگ اس کے خیالات کو سمجھ سکیں اور ان سے اثر لے سکیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ علمیت کے نامناسب اظہار، اصطلاحات کی بھرمار، ترجمے کی اکھڑی اکھڑی عبارت سے پرہیز کیا جائے۔ ہماری تحریر میں ہماری زبان کی خصوصیات جلوہ گر ہوں وہ کسی دوسری زبان کی بھونڈی نقالی ہو کر نہ رہ جائے۔ ادیبوں کی نئی نسل اپنے ادبی سرمائے سے پوری طرح واقف نہیں ہے وہ اسالیب کے اسرار کو نہیں جانتی، اسے اپنے الفاظ کے ذخیرے سے پوری طرح کام لینا نہیں آتا۔ اس وجہ سے اس کی تحریر دل پر اثر نہیں کرتی ذہن میں جاگزیں نہیں ہوتی۔ گہرا تاثر نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ انبساطِ ذہنی نہیں دے سکتی جو اچھے ادب کا انعام ہے۔

ہمارا ادب ایک طرف صحافتی و کاروباری ہو رہا ہے جس کے روکنے کے لیے فکر و فن کے آداب برتنے ہیں دوسری طرف اس میں تفریحی پہلو کی وہ آمیزش ہونے لگی ہے جو اپنے ساتھ بڑے بڑے خطرے لائی ہے۔ فلم اور ریڈیو سے آج کوئی منہ موڑ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ نہ صرف ان پر طنز کر کے اپنی نجات کا سامان کر سکتا ہے اسے تو یہ ملحوظ رکھنا ہے کہ فلم اور ریڈیو کے آداب ادب میں اس طرح راہ نہ پائیں کہ ادبیت کے تقاضے آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں۔ ریڈیو بھی فنی اظہار کا ذریعہ ہے اور فلم بھی، مگر ایک میں سرکاری مصلحتوں کی پابندی ہے، اور دوسرے کے اعصاب پر اقبال کے الفاظ میں "عورت سوار ہے"، اس لیے فلم اور ریڈیو کے مضر اثرات سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اور ان وسائل کی وجہ سے فکر میں جو سستا اور کاروباری میلان پرورش پاتا ہے اس پر کڑی نظر رکھنا لازمی ہے۔

ہمارے نئے ادب میں اب عمومی اپیل کم ہو رہی ہے وہ ٹولیوں یا پارٹیوں کو زیادہ ملحوظ رکھتا ہے تخلیق سے زیادہ تنقید پر زور ہے۔ اور تنقید کے معنی کسی مخصوص نظریے کی اشاعت یا کسی پسندیدہ شاعر یا ادیب کی ستائش کے ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے ادیب ابھی تک اس مرض میں زیادہ گرفتار نہیں ہیں مگر یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے ایسا نہ ہو کہ اس گرم گفتاری کی وجہ سے ادب کی بساط ایک اکھاڑا بن جائے۔ تنقید پر توجہ اچھی چیز ہے خصوصاً اس دور میں جب زندگی اور ادب میں بڑی پیچیدگی آگئی ہے تنقید کے ذریعے سے صحتِ ذہنی کے معیار قائم رکھنا ضروری ہیں، مگر تخلیق پر مناسب توجہ کے بغیر ہماری مثال اس سائیس کی ہو جائے گی جو مالش کا عادی تھا خواہ گھوڑا ہو یا نہ ہو۔

نئے ادیبوں کو خاص طور سے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ اچھا ادب صرف زندگی کی بصیرت اور قدیم و جدید اسالیب کے علم سے وجود میں آتا ہے سستی شہرت کسی کو مل بھی جائے تو دیر پا نہیں ہوتی اور ادب کی دنیا میں خدا کی کائنات کی طرح دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ ہر شخص کو اس کا حق جلد یا بدیر ضرور ملتا ہے لیکن اچھا ادب خود ایک نعمت ہے جو شہرت، عزت، دولت کا محتاج نہیں۔ ہاں یہ چیزیں بالآخر اس کا قدم چومتی ہیں۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ یکم اکتوبر ۱۹۵۷ء)

قومی وحدت کا مسئلہ

ہر طرف سے یہ صدا بلند ہو رہی ہے کہ ہندوستان کے عوام کو قومی وحدت اور یکجہتی کے جذبے سے سرشار ہونا چاہیے۔ معلم، مفکر، سیاسی رہ نما، قومی کارکن، سبھی امن پر زور دیتے ہیں اخباروں میں مضامین نکلتے ہیں۔ کانفرنسوں میں تقریریں ہوتی ہیں۔ مگر کیا ہم ایمانداری سے کہہ سکتے ہیں کہ چند سنجیدہ اور مخلص اشخاص کو چھوڑ کر اکثریت قومی وحدت کا پورا پورا احساس رکھتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہنوز دلی دور ہے۔

چند روز ہوئے دہلی میں ایک اہم سیمنار منعقد ہوا یہ سیمنار یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے تھا۔ پروفیسر ہمایوں کبیر وزیر تہذیبی امور نے اس کا افتتاح کیا اور مسٹر دیشمکھ صدر کمیشن نے صدارت کی۔ مقالات پڑھنے والوں میں حکومت کے وزیر، یونیورسٹی کے وائس چانسلر، پروفیسر سبھی شامل تھے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے کہا کہ ہندوستان کی تاریخ میں وحدت کا تصور ملتا ہے مگر اس وحدت کے یہ معنی نہیں کہ یہاں تہذیبوں، عقائد، خیالات، زبانوں اور رسم و رواج کی رنگارنگی ختم کر دی جائے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یونیورسٹیاں اگر ہندوستان کی تاریخ کو اچھی طرح ذہن میں رکھیں تو اس تنوع اور رنگارنگی کے باوجود قومی یکجہتی اور اتحاد کا نقش اجاگر ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اوّل تو مختلف عقائد میں وحدت تلاش کرنے کا جذبہ عام نہیں ہے دوسرے ایک قومی نظام تعلیم کا صحیح تصور دلوں میں جاگزیں نہیں ہے۔ انہوں نے ایک ایسے ہندوستان کی تعمیر پر زور دیا جس میں تمام مذاہب تمام زبانیں، تمام صلاحیتیں، اور

تمام طبقے اپنے اظہار اور آسودگی کے لیے گنجائش پائیں کیونکہ اسی طرح قومی وحدت کا خواب حقیقت بن سکتا ہے۔

مسٹر دیش مکھ نے کہا کہ ملک کی تقسیم نے وحدت کے تصور پر ضرب لگائی۔ ہم اس سے سنبھلے تھے کہ مختلف دیسی ریاستوں نے سیاسی وحدت کو ختم کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں سردار پٹیل کی کوششوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے اُن ریاستوں کو ختم کرکے ہماری سیاسی وحدت کو بچالیا اُس کے جو شرنارتھی آئے ان کی وجہ سے یک جہتی کے کام میں دشواریاں ہوئیں مگر اب ہم نے اس مہم کو بھی سر کرلیا ہے اب ہمارے قومی منصوبے قومی وحدت کو مضبوط کرنے اور ذہنی ہم آہنگی کو عام کرنے میں بہت مدد دے سکتے ہیں مسٹر دیش مکھ نے اس بات پر زور دیا کہ ہمارے جو اصول ہیں ان پر سختی سے عمل ہونا چاہیے۔ اور جہاں قول اور عمل کا تضاد نظر آئے اس کا سدِّباب کرنا چاہیے۔

مسٹر قانون گو نے کہا کہ ہماری تاریخ پھر سے لکھی جائے۔ ڈاکٹر راؤ نے ایک رسم خط پر زور دیا۔ ڈاکٹر متھائی نے قومی تہذیب کے جدید تصور کو عام کرنے کی حمایت کی۔ ڈاکٹر گنگولی نے یونیورسٹیوں میں جذبات کی ترتیب کے نصاب کی ضرورت محسوس کی اور ذہنی آزادی کی تلقین کی۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں مگر ہمارے خیال میں مسٹر دیش مکھ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ہمارے اصول، ہمارے دعوے، مجمع کے سامنے ہمارے خیالات بہت اچھے سہی مگر عمل کی دنیا میں الٹی گنگا بہ رہی ہے۔ ہمارے دستور کے مطابق ہر مذہب و ملت کو اظہار خیال کی پوری آزادی ہے اور قانون کے نزدیک سب برابر ہیں۔ مگر تنگ نظری، جہالت اور بھیڑ چال اس زرین اصول کو عام ہونے نہیں دیتے ہم نے بارہا اس کا اعلان کیا ہے کہ ہم ذات پات کی بنیاد پر کسی کو ترجیح نہیں دیتے مگر ہماری مجلسی زندگی اور سیاسی کاموں میں ذات پات کا اب بڑا دخل ہے۔ انتخابات کے موقع پر، ملازمتوں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تقرر کرتے وقت ذات پات سے کتنے لوگ بلند رہتے ہیں۔ ہم زبان سے کہتے ہیں کہ ہندوستان کی ہر زبان کو پھلنے پھولنے کا موقع ہے اور کسی زبان کو دوسری زبان پر فوقیت حاصل نہیں مگر ہمارا عمل اس سے بہت مختلف ہے۔

زبانوں کے خلاف تعصب اب بھی بہت ہے۔ اردو ہی کو لے لیجیے کچھ لوگوں نے ٹھان لی ہے کہ اردو کے حقوق کو پامال کرتے رہیں گے۔ اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کچھ لوگ ہندی کو زبردستی سارے ملک پر لادنا چاہتے ہیں غرض بنیادی خرابی یہی ہے کہ ہم باتیں بناتے ہیں اپنے کو فریب اور دوسرے کو غچہ دیتے ہیں۔ ہمارے خیالات کی خوبی اور ہماری نیتوں کی سچائی کو عوام لے کر کیا کریں ان کو تو ہمارے عمل سے سابقہ پڑتا ہے جب تک ہم اپنے عمل سے یہ ثابت نہ کر دیں کہ ہم مذہبی تعصب، لسانی تنگ نظری، مقامی پاسداری، ریاستی مفاد سے بلند ہو گئے ہیں اس وقت تک ملک کی ترقی رکی رہے گی۔ جس دن یہ بات ثابت ہو گئی اسی دن ہمارے سارے ذہنی امراض خود بخود دور ہو جائیں گے۔ اور ہندوستان ذہنی اور مادی خوش حالی کی جنت بن جائیگا ہم دوسروں کو تلقین بہت کرتے ہیں اپنے عمل کو نہیں دیکھتے۔ اپنا احتساب، اپنے عمل کو صالح بنانے کا جذبہ، اپنی اصلاح سب سے پہلے ضروری ہے۔ مسٹر دیش مکھ نے صحیح کہا ہے کہ جب تک قول اور عمل کا تضاد دور نہیں ہوگا ہم ملک میں ذہنی ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا فرض حکومت کا ہے جو گاندھی جی اور نہرو کا کلمہ پڑھتی ہے کیا اُس کا عمل گاندھی اور نہرو کے خیالات کے مطابق ہے ع

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۲۲ اپریل ۱۹۵۶ء)

قومی ضرورت کیا ہے؟

چند روز ہوئے انگریزی کے مشہور شاعر اور نقاد ٹی۔ ایس ایلیٹ کا مضمون "شاعری کا اجتماعی عمل" نظر سے گزرا۔ اس نے شاعری کی اہمیت واضح کرتے ہوئے چند باتیں ایسی کہی ہیں جو آج کے دور میں تمام ہندوستانیوں کو گرہ میں باندھ لینی چاہئیں

پہلی بات تو وہ یہ کہتا ہے کہ تمام اصنافِ ادب میں شاعری سب سے زیادہ مخصوص اور مقامی ہوتی ہے۔ شاعری خیال کے سہارے بھی چلتی ہے مگر دراصل اس میں جذبے کی اہمیت ہے خیال کا ترجمہ دوسری زبانوں میں ہوسکتا ہے مگر جذبہ ایسی لطیف شے ہے کہ دوسری زبان میں اسے منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے ایک خیال کی شاعری کو دوسری زبان میں اس طرح منتقل کردینا کہ اس کی روح باقی رہے قریب قریب ناممکن ہے۔

دوسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ لوگوں کو دوسری زبان سکھائی جاسکتی ہے مگر وہ اس میں شاعری نہیں کرسکتے شاعری وہ اپنی ہی زبان میں کرسکتے ہیں اس کے الفاظ کا اردو ترجمہ یہ ہے:

> "لوگوں سے اس کی زبان چھینی جاسکتی ہے، اسے دبایا جاسکتا ہے، اسکولوں میں دوسری زبان لازمی قرار دی جاسکتی لیکن جب تک لوگوں کو نئی زبان میں محسوس کرنا نہ سکھایا جائے، پچھلی زبان کو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ زبان پھر شاعری میں جلوہ گر ہوگی جو احساس کا آلہ ہے..... ایک اعلیٰ درجے کی زبان شاید ہی ختم کی جاسکے جب تک کہ اس کے بولنے والوں کو ختم نہ کیا

جائے۔ایک زبان دوسری کی جگہ اسی وقت لے سکتی ہے جب عام طور پر چند فوائد اس کے ساتھ وابستہ ہوں اور وہ نہ صرف سوچنے کے لیے بلکہ محسوس کرنے کے لیے ایک وسیع دائرہ بھی عطا کر سکے اور زیادہ لطافت بھی رکھتی ہو۔"

تیسری بات بھی اہم ہے جب تک بڑے ادیب اور بڑے شاعر کسی زبان میں پیدا ہوتے رہیں گے وہ زبان اپنے بولنے والوں کو زندگی کی ایک بصیرت دیتی رہے گی جو کسی اور ذریعے سے انہیں نہیں مل سکتی اور جس کے بغیر ان کی شخصیت نامکمل اور ناقص رہے گی۔ زبان کے زوال کا اثر تہذیب پر پڑے گا اور تہذیب کی خرابی سماج کی خرابی میں ظاہر ہوگی اور رفتہ رفتہ پوری قوم زوال پر آمادہ ہو جائے گی۔

اب دیکھیے کہ کیوں ایک قومی، سماجی، تہذیبی اور جمہوری نقطہ نظر سے ہندوستان میں اردو زبان وادب کی ترقی ضروری ہے اردو صدیوں سے ہندوستان کی ایک بڑی آبادی کی مادری زبان رہی ہے اس زبان میں اعلیٰ درجے کے شاعر پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے کلام کے ذریعے سے زبان میں توسیع کی ہے حسن کاری کے آداب سکھائے ہیں اور زندگی کی صالح قدروں کی عکاسی کی ہے اگر اس زبان کو صدمہ پہنچا تو یہ کس کا نقصان ہوگا صرف اردو والوں کا یا پورے ملک کا۔ اگر صرف اردو والوں کا ہی نقصان سمجھ لیا جائے تو جب اردو والے اس احساس کی دولت، اس بصیرت کے سرمائے، اس جذبے کی حرارت سے محروم ہو جائیں گے جو ان کی زبان کے ذریعے سے انہیں میسّر ہے تو وہ کجی اور بے راہ روی کی طرف مائل ہوں گے، وہ قوم کی ترقی میں رکاوٹ ڈالیں گے اور اسطرح قوم کی ذہنی صحت کو مجروح کریں گے ہر جز کل پر ضرور اثر انداز ہوتا ہے اس قانون سے کوئی مفر نہیں ہے اس کے برخلاف اگر اچھی اردو شاعری پیدا ہوتی رہے گی تو اردو دوستوں کے جذبے کی تہذیب ہوتی رہے گی، انہیں وہ غذا ملتی رہے گی _____ جس کی وجہ سے ان کا ذہن ترقی کر سکتا ہے اور وہ ملک کے ادبی سرمائے اور ذہنی معیار میں اضافہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

شعر و ادب کی ترقی اور زبان کی حفاظت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زبان کی حفاظت صرف اسی ذریعے سے ہو سکتی ہے کہ زبان و ادب کے تسلسل کا احساس رہے۔ معیاری نمونے سامنے آئیں۔ جذبے کو جس طرح شاعری زبان عطا کرتی ہے اس کا گر عام ہوتا رہے، کلاسیکل نمونوں کا علم رہے۔ زبان جس طرح بدلتی ہے اور بدل کر بھی رہتی ہے، سب پر روشن رہے اس لیے ہمارا مطالبہ ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں اردو کے ذریعے سے تعلیم دی جائے۔ اور اردو کی تعلیم کا ——— ہر منزل پر انتظام ہو۔ ہر دور میں پسند بدلتی ہے۔ فیشن میں تغیر ہوتا ہے، سیاسی اور اقتصادی حالات اپنا اثر دکھاتے ہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ جو اصناف یا طرز آج مقبول ہیں وہ لازمی طور پر اچھے بھی ہوں۔ زبان و ادب کی تعلیم اس افراتفری میں تناسب اور توازن سکھاتی ہے۔ مادری زبان میں تعلیم اس لیے اقلیت کا حق ہے اور اکثریت کے صحیفۂ اخلاق کی حقیقت اس کے سامنے مناسب اور موزوں انتظام سے ہی واضح ہو سکتی ہے اگر ہمارے ملک میں قومی اور جمہوری نقطۂ نظر عام ہوتا اور سماجی اور تہذیبی مسائل پر سنجیدگی سے غور و فکر ہوا کرتا تو ہمیں اردو زبان و ادب کی حفاظت کے لیے اتنے پاپڑ نہ بیلنے پڑتے۔ لیکن حالات اب سازگار ہو رہے ہیں اور امید ہے کہ اکثریت خود قومی نقطۂ نظر سے اردو کی حفاظت پر کمربستہ ہوگی اور ایسے حالات پیدا کرے گی کہ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھل سکیں ع

تو ذرا چھیڑ تو دے تشنۂ مضراب ہے ساز

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۱۵ جولائی ۱۹۵۸ء)

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

اردو کی بنیاد ہندوستانی ہے اس کے نقش و نگار میں عرب کا سوز دروں اور عجم کا حسنِ طبیعت بھی جھلکتا ہے اردو کا رشتہ ایک طرف بول چال کی زبان سے بہت گہرا ہے۔ دوسری طرف اس میں علم و فن کے اعلیٰ ترین تصورات کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔ اردو کے پیچھے صدیوں کے چلن کی تاریخ ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے کے اقدار کا عکس بھی۔ ہندوستان کی تاریخ کے تمام اہم میلانات اور عالمی اثرات کے سب حیات بخش اور حیات پرور تقاضے بھی اس میں ملتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اردو کا اب ایک جانا پہچانا، آزمودہ اور کارآمد روپ موجود ہے جسمیں نئے نئے رنگوں کا اضافہ تو ہو سکتا ہے مگر جس کے روپ کو اس طرح نہیں بدلا جا سکتا کہ وہ کچھ اور ہو جائے۔ ایک زمانے میں اِس میں عربی فارسی الفاظ کی بھرمار شروع ہوئی مگر رفتہ رفتہ یہ روش اعتدال پر آگئی۔ صرف وہی الفاظ کھپ سکے جو اس میں کسی اہم کمی کو پورا کر سکتے تھے اس طرح اب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ سنسکرت اور ہندی کے زیادہ سے زیادہ الفاظ اردو میں داخل کر دیے جائیں۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ پراکرتوں کے راستے سے اردو میں آگئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے کارآمد اور مفید الفاظ اس میں خود بخود لیے جا رہے ہیں۔ یہاں تک تو خیریت ہے۔ لیکن سنسکرت کے تت سم الفاظ اور ہندی کی بہت سی ثقیل اصطلاحیں اردو کے آہنگ میں پوری طرح سماتی نہیں اس لیے اس معاملے میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ احتیاط اس لیے کہ زبان کا ایک صوتی نظام ہوتا ہے اردو کے تمام الفاظ کا آخری حرف ساکن ہے یہ بات فطری ہے۔ ایسے الفاظ جن کا آخری حرف

ساکن نہ ہو اردو میں جذب نہیں ہو سکتے ان کی شکل جب تک بدلے نہیں وہ اردو میں استعمال نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہندی کے وہی الفاظ اردو میں استعمال کرنے چاہئیں جو ہمارے صوتی نظام کے مطابق اور ہمارے اسلوب سے ہم آہنگ ہوں۔ اسی طرح عربی فارسی کے وہی الفاظ برتنے چاہئیں جن سے اردوپن باقی رہے انگریزی الفاظ کے لینے میں اردو خاصی فراغ دل رہی ہے۔ یہ بھی اچھی بات ہے، مگر یہاں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ علمی اصطلاحوں میں سے ایسی اصطلاحیں جو ہمارے یہاں موجود نہیں ہیں ضرور لینی چاہئیں مگر ثانوی اصطلاحیں اردو میں اب بھی موجود ہیں، انہیں خارج نہیں کرنا چاہیے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ اب صحت زبان کے پرانے قاعدوں میں کچھ ترمیم کی ضرورت ہے، لیکن یہ ترمیم صرف چلن کو سامنے رکھ کر ہی ہو سکتی ہے اس کے یہ معنی ہرگز نہ لینے چاہئیں کہ زبان کا کوئی مزاج نہیں ہے۔ اور صحت کا کچھ معیار ہی باقی نہ رہے اور ہر شخص جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ ہم ہندی اور فارسی کی اضافت کو جائز نہیں سمجھتے حال آنکہ ہمارے بڑے بڑے شاعروں اور ادیبوں نے اس قاعدے کی ہر حال میں پابندی نہیں کی۔ اس معاملے میں کچھ اور فراغ دلی کی ضرورت ہے۔ ہم اب بھی ہر لفظ کے عربی یا فارسی یا سنسکرت روپ پر اصرار کرتے ہیں حال آنکہ اس سے اردو کی خود مختاری پر حرف آتا ہے۔ ہم صرف شعرا اور وہ بھی دہلی یا لکھنو کے شعرا کے کلام سے سند لیتے ہیں حال آنکہ معیاری نثر نگار بھی سند ہیں، پھر زبان کے سلسلے میں دہلی اور لکھنؤ کی قید بھی اب اتنی شدید نہ ہونی چاہیے۔ وہ تمام الفاظ جو ہمارے اچھے اور ممتاز شاعروں اور ادیبوں نے استعمال کیے ہیں اور عرصے تک رائج ہیں صحیح مان لینے چاہئیں اس طرح غلط العام کیساتھ غلط العوام کو بھی بڑی حد تک جائز کرنا پڑیگا۔ اردو کے مانوس اور مسلم رنگ و آہنگ کو قائم رکھتے ہوئے مسلسل اور مروجہ عناصر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اردو کی ترقی پسند اور ترقی پذیر خاصیت کو ترقی دینا ہمارا فرض ہے۔ قید کی حد میں آزادی کی حد بڑھا لینا اور پھر بھی ایک ہمہ گیر نظم کی پابندی کرنا، یہی ہمارا فرض ہونا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زبان میں اس مسئلے پر بحث ہو اس لئے ہم نے چند اصولوں کی طرف ہی اشارہ کافی سمجھا ہے مثالیں بعد میں دی جائیں گی۔ اردو کی گرامر کی ضرورت آج جتنی شدید ہے پہلے کبھی نہ تھی۔ یہ پچھلی گرامر سے بالکل مختلف نہ ہوگی ہاں اس میں قدما کی بعض روشوں کو اپنایا جائے گا جنہیں لکھنو کے درباری ماحول کی وجہ سے ترک کر دیا گیا۔

(ہماری زبان، علی گڑھ یکم ستمبر ۱۹۵۸ء)

جذباتی ہم آہنگی کیسے ہو؟

مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم نے جو جذباتی ہم آہنگی کمیٹی بنائی تھی اس کی سفارشات اخباروں میں آرہی ہیں اس کمیٹی کے صدر شری سمپورنانند تھے اور اس کے ممبروں میں بعض مشہور قومی کارکن اور ماہرین تعلیم تھے لیکن حیرت ہوتی ہے کہ کمیٹی نے مسئلے کی روح کو چھوا تک نہیں اور چند جزوی باتوں پر بہت زور دیا ہے مثلاً کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ سال میں دو مرتبہ طلبہ سے قومی عہد لیا جائے، روزانہ اسکول شروع ہوتے وقت قومی ترانہ گایا جائے، طلبہ کے لیے ایک مشترک لباس ہو، سماجی لحاظ سے بچھڑے ہوئے طلبہ کے لیے تعلیمی سہولتیں ہوں۔ درسی کتابوں پر کل ہند اور عالمی سمینار ہوں اور عالمی نمائشوں کا انتظام کیا جائے۔ کمیٹی نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر تعلیمی اداروں میں داخلہ اور وظائف وغیرہ دینے میں بنیادی اہلیت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس سے بھی قومی یکجہتی میں مدد ملے گی نیز ثانوی تعلیم کی منزل پر اس لسانی فارمولے کی بھی تائید کی ہے جس کی سفارش وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس نے اگست ۱۹۶۱ء میں کی تھی۔ لسانی اقلیتوں کے اس مطالبے کی بھی کمیٹی نے تائید کی ہے کہ انہیں ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں ملنی چاہیے۔ مگر ثانوی تعلیم کے لیے علاقائی زبانوں کو موزوں قرار دیا ہے، ہاں مخصوص حالات میں دستور میں دی گئی کسی دوسری زبان یا انگریزی میں تعلیم کی بھی سفارش کی ہے۔

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ ان میں سے کوئی سفارش نئی نہیں ہے ان میں سے ہر ایک کے متعلق بار بار کہا گیا ہے پھر ان میں سے بہت سی ایسی ہیں جو ذہن کی تبدیلی سے زیادہ

صرف اوپری تبدیلی لاسکتی ہیں قومی ترانہ ہر اسکول میں گایا جاتا ہے اور گایا جانا چاہیے مگر اس سے کچھ اثر بھی قبول کرنا چاہیے۔ اسے محض رسم نہیں سمجھنا چاہیے مشترک لباس کی خوبیاں بھی ظاہر ہیں مگر دلوں میں فرق ہو تو مشترک لباس کیا کرے گا۔ اسی طرح درسی کتابوں میں مناسب اور موزوں سبق ہوئے بھی تو جب تک پڑھانے والوں اور پڑھنے والوں کا ان پر عقیدہ نہیں ہے اور روزمرہ زندگی میں یک جہتی کے بجائے انتشار اور پراگندگی کے ہر طرف مظاہرے ہوتے رہتے ہیں، صرف اوپری ٹیم ٹام سے کیا ہوگا۔ دستور میں تو اب بھی ابتدائی تعلیم اقلیتوں کی مادری زبان میں دینے کی ہدایت ہے مگر کیا انصاف سے کہا جاسکتا ہے کہ اس ہدایت پر قرار واقعی عمل ہوتا ہے۔ ثانوی منزل پر سہ لسانی فارمولے کی تحریک بھی نئی نہیں ثانوی تعلیم کے لیے مدالیار کمیشن نے یہ سفارش برسوں پہلے کی تھی مگر یا تو اس فارمولے کی غلط تعبیر کی جارہی ہے یا سرے سے اس پر عمل ہی نہیں ہو رہا ہے۔

اس لیے ہماری رائے میں اب صرف ان باتوں پر زور دینے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ باتیں اچھی ہیں اور مفید بھی ہو سکتی ہیں، مگر ان پر عمل کرنا ہے تو لوگوں کے ذہن بدلنے ہوں گے۔ گروہوں، ٹولیوں اور چند طاقت ور اشخاص کا زور ختم کرنا ہوگا۔ علاقائی تعصب کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ فرقہ پرستی کا ڈٹ کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ زبان کے نام پر نفرت پھیلانے کو قومی جرم قرار دینا پڑے گا اقلیتوں کو بہلانے کے بجائے ان کے حقوق کا پورا احترام کرنا پڑے گا۔ قومی یک جہتی، باتوں سے نہیں ہوگی، عمل سے ہوگی۔ اس کے لیے سیاسی گروہ بندیوں کو اپنے حدود میں رکھنا پڑے گا۔ اس کے لیے ریاستوں کو من مانی کرنے سے روکنا پڑے گا اس کے لیے زبردستی کرنے سے باز رکھنا پڑے گا۔ اس کے لیے حق پر اصرار اور فرائض سے غفلت کی پالیسی ترک کرنی پڑے گی۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا ہمارے سیاست داں سمجھتے ہیں مگر یہ ہو سکتا ہے اور کرنا ہے۔ اسی لیے جمہوریت کی روح کو عام کرنا ہے، مساوات کے معنی سکھانے ہیں اور ان معنی پر ہر حال میں اصرار کرنا ہے۔ اسی لیے تشدد، زبردستی، دھونس کو ختم کرنا ہے۔ اسی لیے ان شاطروں کی قلعی کھولنا ہے جو کبھی مذہب کے نام پر، کبھی پراچین تہذیب کی دہائی دے کر، کبھی فرد کی عزت نفس کا نام لے کر، کبھی اپنے علاقے

سے وفاداری کے جذبے کو ابھار کر قومی یک جہتی کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اقلیتوں کے سارے مطالبات آج ہی مان لیے جائیں مگر یہ تو ہونا ہی چاہیے کہ جو مدت ہوئی مان لیا گیا، اس پر عمل ہوا اور جو عمل نہ کرے اس سے اس طرح باز پرس ہو کہ وہ دوبارہ غفلت نہ کر سکے۔ عام طور پر چند ہی لوگ اخلاقی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ وہ اصولوں کی ان کی خوبی کی وجہ سے پیروی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ زیادہ ہوتے ہیں جو اصول کو مانتے ہیں مگر عمل اس لیے نہیں کرتے کہ عمل کرنے میں جو تھوڑی بہت زحمت ہوتی ہے یا جس کی وجہ سے سستی مقبولیت میں کمی آتی ہے اس کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ بیشتر لوگ صرف اس لیے عمل نہیں کرتے کہ نہ کرنے سے ان کا کوئی ایسا نقصان نہیں ہوتا جو ان کی ناک کے سامنے ہو اور حقیقی نفع یا نقصان وہ دیکھ نہیں سکتے۔

ہمیں اندیشہ ہے کہ کمیٹیاں بنتی رہیں گی اور ان کی خوش آئند سفارشات سے ہم بہلتے رہیں گے مگر ان پر عمل کی زحمت کوئی گوارا نہیں کرے گا کیونکہ اس سے ووٹ نہیں ملیں گے تو اقتدار ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہمارے عوام میں خلوص ہے مگر ابھی سمجھ نہیں ہے اس لیے چالاک لوگ انہیں کچھ عرصے تک کھلونے دے کر بہلاتے رہیں گے اور اپنا الّو سیدھا کرتے رہیں گے لیکن چونکہ ہمیں اپنی قوم پر اعتماد ہے اس لیے امید ہے کہ جلد وہ مطلبی اور مخلص لوگوں میں فرق کرنا سیکھ لے گی۔ اور آج کے نشے کے بجائے کل کی نجات پر نظر رکھنے لگے گی۔ قومی یک جہتی کے لیے سب کو جد و جہد کرنا پڑے گی۔ صرف حکومت کی تجاویز اور کمیٹیوں کی سفارشات سے یہ مہم سر نہیں ہو سکتی۔ ہر فرد اور ہر جماعت کو اپنے فرائض ادا کرنے ہوں گے اور حقوق طلبی کی لے کم کرنی ہوگی۔ قوم کی ترقی قومی یک جہتی میں مضمر ہے اور یک جہتی کے بغیر ترقی کا ہر خواب ایک سراب ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اس کا نام لے کر داد لینا لوگ کم کر دیں، ہاں اس کو فرض سمجھ کر اس پر عمل کرنا اپنا شعار ضرور بنا لیں۔

(ہماری زبان علی گڑھ۔ ۸ جنوری ۱۹۶۲ء)

ذہن کا دریچہ کھلا رکھیے

ترجنیف کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ اپنا تخلیقی کام کرتا تھا تو اس کے پیروں کے نیچے گرم پانی کی بوتل ہوتی تھی اور اس کے کمرے کا دریچہ باغ کی طرف کھلا ہوتا تھا۔ ہمارے میر صاحب کے متعلق آزاد نے کہا ہے کہ ایک دفعہ وہ بیمار ہوئے اور ان کے ایک امیر دوست انہیں ایک ایسے مکان میں لے گئے جس میں باغ بھی تھا۔ میر فکرِ سخن میں اتنے محو رہتے تھے کہ بہت دن تک انہیں اس کا پتہ ہی نہ چلا کہ جس کمرے میں وہ مقیم ہیں اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے۔ آخر ایک دن ان کے دوست نے انہیں بتایا تو اپنے مسودوں کی طرف اشارہ کر کے بولے کہ میں اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔

مجموعی طور پر یہ بات آج بھی ہمارے بہت سے ادیبوں اور شاعروں پر صادق آتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ باغ کی کھڑکی بند ہے اور گرم پانی کی بوتل یا تو اتنی گرم ہے کہ اس کے اثر سے دماغ پر ابخرات چڑھ گئے ہیں یا اتنی ٹھنڈی ہو گئی ہے کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ پھر شاعروں اور ادیبوں کا ہی یہ حال نہیں بلکہ پوری قوم اسی کشتی میں سوار ہے۔ اگر ہم اپنے ذہن کا دریچہ کھلا رکھیں تو چند ایسے حقائق ہمارے سامنے آئیں گے جن سے کسی طرح غفلت نہیں برت سکتے۔ ان کا گنانا نامناسب نہ ہوگا۔

① اقبال کے الفاظ میں عشق کو عقلِ خداداد کی پیروی کرنی چاہیے۔

② عقلِ خداداد ہمیں علم کی طرف لے جاتی ہے۔ علم میں نہ صرف اپنا علم بلکہ گردوپیش بلکہ کائنات کا علم بھی شامل ہے۔

(۳) دنیا چوں کہ کہاں سے پہنچ چکی ہے اس لیے اس کے متعلق پرانے اندازے سب غلط ہو گئے ہیں اور اب ایک پل پہلے جو کچھ ہوا ہے اس کا ہمیں نہ صرف علم بلکہ عرفان ہونا چاہیے۔

(۴) علوم طبعی کی حیرت انگیز ترقی نے اور سماجی علوم کی نشو ونما نے دنیا کو جو غیر معمولی دولت عطا کی ہے اس سے ابھی وہ مناسب کام نہیں لے سکی ہے۔

(۵) فطرت پر حکمرانی اور طاقت کے نئے نئے امکانات نے ان لوگوں میں جن کے پاس سب کچھ ہے ایک نشہ بھر دیا ہے وہ اپنی طاقت کے بل پر دھونس جمانے لگے ہیں اور انہیں اس کا احساس نہیں کہ دنیا کا بڑا حصہ ابھی بنیادی ضروریات کو ترستا ہے۔

(۶) مادّی ترقی کے ساتھ انسانی، اخلاقی، سماجی قدریں بھی سب کو ملتیں تو ایک توازن رہتا۔ مگر مادی ترقی نے انسانی، اخلاقی اور سماجی قدروں کو جذب نہیں کیا، ان کا اوپر سے احترام کافی سمجھا۔ اس عدم توازن کی وجہ سے ہر جگہ مادی ترقی کے آغاز کے ساتھ ایک اخلاقی بحران کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

(۷) جو قومیں ابھی آزاد ہوئی ہیں ان میں برسر اقتدار طبقہ قوم کے آدرشوں پر چلنے کے بجائے، ان آدرشوں کا نام لے کر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ چند سچے رہنما مستثنیات میں سے ہیں۔

(۸) آدرشوں پر عوام اب بھی یقین رکھتے ہیں مگر روزمرہ زندگی میں ان کی پامالی دیکھ کر ان کا یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔

(۹) ٹیکنالوجی اپنے ساتھ بے انتہا مصروفیت اور نتیجے میں تھکے ہوئے اعصاب کے لیے سستی تفریح لاتی ہے جس کی وجہ سے تہذیبی قدریں پامال ہوتی ہیں۔

(۱۰) ٹیکنالوجی نے کاریگروں کی پیداوار کو کافی سمجھا ہے وہ انسانیت کی بنیادی قدروں کی طرف توجہ نہیں کرتی۔

(۱۱) کوئی ملک علیحدہ نہیں ہے۔ افریقہ یا اسٹریلیا کی بساط پر اگر زلزلہ آتا ہے تو اسکی دھمک ہندوستان میں محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے اب دوسرے ملکوں کے متعلق کما حقہ علم پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔

(۱۲) سچی قومیت جو بالآخر بین الاقوامیت کی طرف لے جاتی ہے کسی اونچ نیچ کی روادار نہیں ہے خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہو یا ذات برادری کی بنا پر یا زبان کی بنا پر یا علاقے کی بنا پر۔

(۱۳) بجلی سے پہلے مٹی کے تیل کا رواج تھا اس سے پہلے موی شمعوں کا۔ اب جوہری توانائی سے بھی کام لیا جارہا ہے۔ جوہری توانائی کے دور میں موم بتی کا چراغ نہیں جل سکتا۔

(۱۴) جوہری توانائی کے قافلے میں شامل ہونے والوں کے پاس اگر انسانیت کی قدریں ہیں تو خیریت ہے۔ ورنہ یہ دوڑ تباہی کی طرف لے جائے گی۔

(۱۵) یہ دور جمہوریت کا ہے، مگر جمہوریت کے معنی اکثریت کی آمریت کے نہیں۔ نہ اقلیت کے اس نعرے کے ہیں کہ لاؤ میری چنے کی دال۔

(۱۶) قومیں عام طور پر اخلاق کی بنا پر نہیں، اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اپنی پالیسی بناتی ہیں۔ اس لیے اخلاق پر ایمان کے ساتھ اپنے مفادات کی حفاظت بھی ضروری ہے۔

(۱۷) اچھا سماج امن پسند ہوتا ہے مگر جنگ کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ جنگ کی تیاری جنگ کو روکنے کے لیے مفید ہو سکتی ہے کیونکہ بدقسمتی سے اخلاقی طاقت کا لوگ اعتراف تو کرتے ہیں مگر مادی طاقت کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔

(۱۸) جو ظرف خالی ہوتا ہے وہ سب سے زیادہ آواز دیتا ہے۔ خاموشی گمبھیر ہے جو باتیں زیادہ کرتے ہیں وہ عمل کے میدان میں نیم جان ثابت ہوتے ہیں۔

(۱۹) جو قوم اپنا احتساب نہیں کر سکتی اسے دوسری قوم پر نکتہ چینی کا حق نہیں۔

(۲۰) ہنگامی حالات میں اس بات کی ضرورت اور بھی شدید ہوتی ہے کہ روزمرہ کا کام خوش اسلوبی سے چلتا رہے۔ لندن پر جب بم باری ہو رہی تھی تو ایک دوکان پر یہ بورڈ لگا تھا کہ "کاروبار بدستور"

ان اشاروں کی وضاحت آئندہ کسی شمارے میں کی جائے گی۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ فروری ۱۹۶۳ء)

چوٹی کی بات

ہم نے کچھ عرصہ ہوا صدر ہندوستانی اکیڈمی یوپی کو توجہ دلائی تھی کہ وہ اکیڈمی کی روایت اور تاریخ کا احترام کرتے ہوئے اُردو میں کام پر بھی زور دیں۔ انہوں نے اس مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار تین قسطوں میں اخبار کے ذریعے سے کیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ توجّہ طلب ہے اور اس پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے مگر ان کے مضامین کا لبِ لباب یہ ہے کہ ایک زمانے میں خاص حالات کی وجہ سے اردو کو ایک ممتاز جگہ حاصل تھی موجودہ حالات میں اب یہ ممتاز جگہ ہندی کو مل گئی ہے اس کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ اب اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے سوائے اِس کے وہ ایک کلاسیکل زبان بن جائے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس مسئلے پر باوجود نیک نیتی کے اچھی طرح غور نہیں کیا۔ آج یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہندی کو سب سے ممتاز جگہ کیوں دی جارہی ہے۔ ہندی ہر طرح اس کی مستحق ہے۔ اتر پردیش تک ہی اگر بات محدود ہے تو اچھا ہے۔ اُتر پردیش کی بہت بڑی اکثریت ہندی کو اپنی زبان سمجھتی ہے اور اگر ہندی کی ترقی کے لیے کوشش کرتی ہے تو یہ اچھی بات ہے اس لیے ہندی کی ترقی کے مسئلے کو اس بحث میں لانے کی ضرورت نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اتر پردیش کی حکومت، اس کے علمی اداروں اور اُس کے عوام کو اردو کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی صاحب یہ بھی کہنے لگیں کہ اگر ہندی کی ترقی کے لیے کوشش ہو رہی ہے

تو یہ بہت کافی ہے اب اور کسی چیز پر توجہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اتر پردیش صرف ہندی کی خدمت کر کے ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ ہندی پر زیادہ توجہ ضرور صرف کرے اور اسے ایسا کرنا چاہیے۔ مگر وہ اردو سے بے نیاز ہو کر اپنا نقصان کرے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو اتر پردیش کا سارا کام ایک زمانے میں اردو میں ہوتا تھا۔ اور اس کی تاریخ، اس کے مزاج، اس کے انتظام، اس کی تہذیب، اس کے علوم، اس کے فنون سے واقفیت کے لیے اردو سے واقفیت ضروری ہے۔ دوسرے آج بھی اس کی آبادی کا ایک خاصا اہم حصّہ، جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اردو بولتا اور لکھتا ہے۔ اس کے ذہن، اس کی نفسیات، اس کی شخصیت، سیرت کی اردو کے ذریعے تعمیر ہوتی ہے۔ اس کے دل و دماغ تک رسائی، اسی ادب کے ذریعے سے بروئے کار آسکتی ہے۔ تیسرے ہماری جمہوریت کا اصول یہ ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ وہ انصاف ہو جو انہیں انصاف نظر آئے۔ نہ کہ وہ انصاف ہو جسے اکثریت انصاف کہتی رہے مگر اقلیت کو وہ نظر کچھ اور آئے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اقلیت کی کوئی آمریت ہوتی ہے ہاں اس کے معنی یہ ضرور ہیں کہ ان کے جذبات کا احترام اس طرح ہوتا ہے کہ وہ اطمینان کے ساتھ قومی تعمیر کے کام میں شریک ہو سکیں۔

اسی لیے سی، بی، راؤ کا یہ کہنا کہ چوٹی پر صرف ایک زبان کی جگہ ہوتی ہے صحیح نہیں۔ اوّل تو ایورسٹ کی چوٹی پر بھی کہا گیا ہے کہ ایک سے زیادہ آدمی ایک وقت میں سما سکتے ہیں، دوسرے قوموں اور زبانوں کی ترقی کو اتنا یک رخا سمجھنا غلط ہے۔ ہم اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ ہندی کی ترقی کے ساتھ اردو کی ترقی ممکن ہے۔ ہم یہ بھی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اردو کی ترقی کے لیے راہیں نکالنے سے کسی طرح ہندی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ ہاں ہندی بالآخر زیادہ مال دار ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بھی کہنا ہے کہ جس طرح اردو کو ابھی ہندی سے بہت سیکھنا ہے اسی طرح ہندی کو بھی اردو سے بہت کچھ لینا ہے۔ لین دین کا سلسلہ جتنے بڑے پیمانے پر ہو اتنا ہی سماج کی ترقی اور پھیلاؤ کے لیے مفید ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہندی کی ترقی کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ دوسری زبانوں کو ترقی کرنے کا موقع نہ ملے۔ اگر ایسا ہے تو یہ نہایت ناسمجھی کی بات ہے۔ زبانیں اپنی طاقت کے بل پر زندہ رہتی ہیں۔ کسی زبان کی مخالفت یا اس کے دبانے کے ساتھ ان کی ترقی وابستہ نہیں ہوتی۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ اتر پردیش کی بولیاں ہندی سے قریب ہیں اور اردو سے بعد رکھتی ہیں۔ اتر پردیش کے مغربی حصّے میں زیادہ تر کھڑی بولی کا رواج ہے۔ یہاں شہر اور دیہات کی زبان میں ایک بنیادی رشتہ ہے اور شہر والے دیہات والوں کی اور دیہات والے شہر والوں کی بات سمجھ لیتے ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس بولی پر اردو کے گہرے اثرات ہیں۔ پھر اتر پردیش کی وہ معیاری بولی جسے آپ غازی آباد سے مغل سرائے تک سن سکتے ہیں، اردو کے الفاظ سے مالامال ہے۔

ہر زبان وقت کے ہاتھوں کچھ بدلے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں ہندی یا سنسکرت کے الفاظ کچھ اور شامل ہوجائیں مگر وہ اردو کے ان الفاظ کو جو اصلاً دیشی الفاظ ہیں اور جنہیں تراش کر کچھ سڈول کر لیا گیا ہے، ترک کیوں کرے۔ رات کو راتری گھر کو گرہ دودھ کو دُگدھ، کیوں بنائے۔ اگر ہندی کو سب کی زبان بنانا ہے تو اس میں سب سے اثر قبول کرنے کے لیے بھی گنجائش ہونی چاہیے۔ اور اس لحاظ سے اردو کا حق سب سے زیادہ ہے، کیوں کہ اردو ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے۔ ہندی اگر اردو سے بیر رکھے گی تو اس کے اندر بیر کی درشتی پیدا ہوجائے گی۔ اس سے اردو کا نقصان تو ہوگا۔ ہندی کا بل بھی کم ہوگا۔

ہندوستانی اکیڈمی ایک علمی اور ادبی ادارہ ہے اسے سب علوم کی اور ادبیات کی خدمت کھلے دل سے کرنی چاہیے۔ ہندی کے ساتھ اردو کی خدمت ہوسکتی ہے اور بعض جگہ ہو بھی رہی ہے۔ چاہے تو ہندوستانی اکیڈمی بھی کرسکتی ہے نہ چاہنے کی بات اور ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸/اگست ۱۹۶۳ء)

لال قلعے میں

ہجومِ "شوق"، نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

(تصرف کے لیے غالبؔ سے معذرت کے ساتھ)

۷ر نومبر ۱۹۶۳ء کو لال قلعے کے در و دیوار نے ایک ایسا روح پرور منظر دیکھا، جس کا ایک عرصۂ دراز سے انہیں انتظار تھا۔ دہلی اس کے لیے بے تاب تھی، ہندوستان اس کے لیے مضطرب اور مشتاق تھا۔

ایک سو ایک سال پہلے، ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں آخری مغل تاجدار، اردو کے ممتاز شاعر، صوفی صافی مَرد درویش بہادر شاہ ظفر نے قید فرنگ میں جان دی۔ مغل باہر سے آئے تھے، مگر ہندوستان میں بس گئے اور ہندوستانی ہو گئے۔ ان کے دور میں ہندوستان کے تہذیب و تمدن کو اور بھی آب و تاب ملی، انہوں نے اپنی رواداری اور صلح کل کی پالیسی سے سب کا دل موہ لیا، انہوں نے اشوک کے بعد ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت دی، انہوں نے فنون لطیفہ کی ایسی سرپرستی کی کہ ہندوستان ایک نگار خانہ بن گیا۔ ان کے اثر سے کھڑی بولی نے وہ روپ رنگ نکالا کہ اردو بن کر بازار، خانقاہ اور دربار تک پہنچی اور لاکھوں بلکہ کروڑوں کے دل کی دھڑکن اور ہونٹوں کی لے بن گئی۔ انہوں نے بھگتوں اور صوفیوں کی وہ قدر کی کہ ان کے پیام محبت نے شیخ و برہمن کو یک جا کر دیا۔ مگر وقت کے قانون کے مطابق جب ان کے اقتدار کو زوال ہوا اور آپس کی پھوٹ سے مغرب کے تاجروں نے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو اپنے دام میں

اسیر کرلیا، تو آزادی کے متوالوں کی نگاہیں قیادت کے لیے اس مغل تاجدار کی طرف اٹھیں جو ہماری مشترک تہذیب کی علامت تھا اور جو اپنی ذات میں صدیوں کی چمن بندی کے سارے اثرات کو سموئے ہوئے تھا۔ یہ اہم نہیں کہ بہادر شاہ کس طرح اس صف میں پہنچے، اہم بات یہ ہے کہ وہ اس تاریخی موڑ پر کہاں تھے کس صف میں تھے اور ان کا زوال کیا تھا۔ آزادی کے متوالوں کو صرف بہادر شاہ کا در اس لیے نظر آیا کہ اس پر ساری ہندوستان کی آنکھیں جم سکتی تھیں، وہی علامت سب کے ذہنوں اور دلوں کو ایک مرکز پر لاسکتی تھی، اسی کے جھنڈے تلے سب جمع ہوسکتے تھے۔

بہادر شاہ ظفر کی یہ برابر کوشش رہی کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی قیادت میں قابل ترین اشخاص آگے آئیں مگر آپس کی رقابتوں نے ان کی چلنے نہ دی۔ انہوں نے ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے انگریزوں کی ہر کوشش کو ناکام بنایا مگر چھوٹی طینتوں اور محدود ذہنوں میں کشادگی اور فراخی کیسے پیدا کردیتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کی یہ پہلی لڑائی ناکام ہوئی۔ انگریزوں نے بہادر شاہ کو گرفتار کرلیا۔ ان کے جوان بیٹوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے گولی سے شہید کیا اور ان پر بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ ایسا بھی اندھیر دنیا نے دیکھا ہوگا کہ جائز حکمراں کو باغی قرار دیا جارہا تھا اور غاصب عدل کا ڈھونگ کھڑا کرکے اس پر بغاوت کا مقدمہ چلا رہے تھے۔ بہرحال بہادر شاہ کو رنگون بھیج دیا گیا۔ جہاں انہوں نے ۱۸۶۲ء میں جان جان آفریں کو سپرد کردی۔

آزادی کی تحریک نے ہمیں اپنے مجاہدوں، رہنماؤں اور شہیدوں کی عظمت کا اعتراف سکھایا۔ نیتاجی سبھاش بوس نے رنگون میں بہادر شاہ کی قبر پر عہد کیا کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور ظفر کی قبر کو دہلی لے جائیں گے۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو ہر محب وطن کے دل میں یہ آرزو مچلنے لگی کہ کسی طرح ظفر کو "کوئے یار" میں دو گز زمیں مل جائے اور اس کی روح کی یہ آرزو پوری ہوجائے۔ ڈاکٹر تاراچند نے آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ظفر کے کارنامے کی عظمت کو واضح کیا۔ اور ۱۹۶۲ء میں بزم ظفر نے ظفر کی صد سالہ برسی کے موقع پر ایک خاص اجتماع کا پروگرام بنایا مگر ہنگامی حالات کی وجہ سے اس وقت سب باتیں ملتوی کرنی پڑیں۔

ہر محب وطن کو اس خبر سے تسکین ہوتی تھی کہ امسال لال قلعے میں ایک تاریخی اجتماع ہو گا جس میں ظفر کو خراج عقیدت پیش کیا جائے گا اور اس اجتماع کا افتتاح ہمارے محبوب وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو فرمائیں گے۔

چنانچہ ۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو یہ اجتماع ہوا جس کے لیے کتنے دنوں سے دیدہ و دل فرش راہ تھے لال قلعے کی دیواروں نے جاہ و جلال، عظمت و عبرت کے کتنے مناظر دیکھے ہیں، شمشیر و سناں اور طاؤس و رباب کے کون سے کرشمے ہیں جو یہاں پیش نہیں کیے گئے۔ مگر یہ اجتماع اپنے اندر ایک نئی شان، ایک نئی آن رکھتا تھا۔ جمہوریت کا پرستار، شاہی سے بیزار، نیا ہندوستان ایک بادشاہ کے آگے سر جھکا رہا تھا ہندوستان کا وزیر اعظم جو ہماری آزادی کی جنگ کا سب سے بڑا سورما اور جو ہمارے رہنما گاندھی جی کا جانشیں ہے، گویا نظر کردہ صاحبقران ہے، جو ماضی کی تمام صالح روایات کو عزیز رکھتے ہوئے، نئے دور کا انسان ہے جس نے ہندوستان کو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے راستے پر چلنا سکھایا ہے جو اپنی دلنواز شخصیت اور پرسوز طبیعت کی وجہ سے آج ایک دنیا کا محبوب ہے۔ وہ علانیہ، صاف الفاظ اور بے جھجک انداز میں ایک بادشاہ کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کر رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ محض ایک بادشاہ تھا بلکہ اس لیے کہ وہ ہندوستانی تھا، ہماری مشترک تہذیب کا علمبردار تھا، ہماری قومی زبان اردو کا ایک ممتاز شاعر تھا اور سب سے بڑھ کر اس لیے کہ انگریزوں کے خلاف پہلی قومی جنگ اسی کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں تو ہندوستان ناکام رہا۔ مگر آزادی کی لڑائی میں تو ناکامیاں ہی رفتہ رفتہ کامیابی کا روپ دھارتی ہیں۔

دیوان عام کی سیڑھیوں پر ایک چھوٹا سا اسٹیج بنایا گیا تھا جس پر پنڈت جواہر لال نہرو، بہادر شاہ ظفر کی پڑپوتی شہزادی قمر سلطان، ڈاکٹر تارا چند، نورالدین احمد، کرنل بشیر حسین زیدی، بیگم بھوپال اور استقبالیہ کمیٹی کے دوسرے ارکان رونق افروز تھے۔ دیوان عام میں اس طرح روشنی کی گئی تھی وہ تخت منور ہو گیا تھا جس پر ظفر رونق افروز ہوتے تھے۔ سیڑھیوں کے پاس سے کرسیوں کی قطاریں تھیں اور چھ سات ہزار آدمی پنڈت جی، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر ذاکر حسین کی تقریریں سن رہے تھے۔ ذاکر صاحب کی

تقریر ان کی عدم موجودگی میں مرزا محمود بیگ نے پڑھ کر سنائی۔

ڈاکٹر تاراچند کی تقریر ایک تاریخی دستاویز بھی تھی، ایک عاشق کا خراج عقیدت بھی تھا اور ایک عارف کا نغمۂ معرفت بھی، اس مغل دور کے کارناموں کا اعتراف تھا اور ظفر کے کارناموں پر سیر حاصل تبصرہ، نئی دہلی نے پرانی دہلی کی یاد میں سر جھکایا تھا، مورخ نے اپنے ایک ہیرو کی عظمت کی طرف اشارہ کیا تھا، اس دور کے ایک مسلّم دانشور اور مایۂ ناز فرزند نے ایک بزرگ قوم کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا۔ حال نے ماضی کو اپنایا، اس پر فخر کیا اور اس سے مستقبل کے لیے نیا ولولہ حاصل کیا۔

ڈاکر صاحب موجود ہوتے تو ان کی تقریر کی بات ہی کچھ اور ہوتی۔ مرزا محمود بیگ صاحب نے اپنے انداز بیان کے جوہر دکھائے مگر وہ ساحری کہاں سے لاتے جس کے سامنے مشکل سے کسی کا چراغ جل سکتا ہے۔ جنرل شاہ نواز نے نیتاجی کے ظفر کی قبر پر جانے اور ہندوستان کو آزاد کرانے کا عہد کرنے کا قصہ سنایا۔ بیگم اختر نے ظفر کی غزل جس دل سوزی سے گائی اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ موسیقی میں غزل کے پورے حسن کو رونما کرنے کے لیے شاعری سے مس ضروری ہے۔ اس کے بعد اوشا سیٹھ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور آخر میں برجو مہاراج اور ان کے ساتھیوں نے کتھک رقص کا ایک نادر نمونہ پیش کیا۔ کتھک سرتاپا شاعری ہے۔ اور اس موقع پر یہ شاعری تو بہت سے دلوں کو تڑپا گئی۔

جو لوگ اس اجتماع میں موجود تھے انہوں نے اس موقع پر روح میں ایک ایسی بالیدگی، جذبات میں ایک ایسی آنچ اور ذہن میں ایک ایسی رفعت محسوس کی، جسے وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ اپنے پیارے وطن ہندوستان کی خدمت کا جو ولولہ اس یادگار اجتماع سے بیدار ہوا وہ جوہری توانائی کی طرح مدتوں تعمیر و تشکیل کے نقش اُبھارتا رہے گا۔

آٹھ بجے شب کے قریب یہ روح پرور نشست ختم ہوئی۔ ساڑھے نو بجے شب سے مشاعرہ شروع ہوا۔ اس کی داستان دوسری قسط میں دیکھیے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء)

(۲)

(یوم ظفر کا مشاعرہ)

مشاعرے کا آغاز جناب نورالدین احمد میئر دہلی کی صدارتی تقریر سے ہوا۔ آپ نے چند الفاظ کہنے کے بعد احمد محی الدین صاحب کی انگریزی نظم بہادر شاہ ظفر پر سنائی۔ اسکے بعد جگن ناتھ آزاد نے اپنے والد اور اردو کے بزرگ شاعر حضرت تلوک چند محروم کی چند رباعیات سنائیں جو اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد شعرا نے یا تو ظفر پر نظمیں سنائیں یا ان کے اس مصرعے پر کہی ہوئی غزلیں پڑھیں۔ ع

کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

اس موقع پر مجمع پانچ چھ ہزار سے کم نہ ہوگا۔ گوپی ناتھ امن کی غزل کے کچھ اشعار بہت پسند کیے گیے۔ سلام مچھلی شہری کو ان کے پر خلوص خراج عقیدت پر بہت داد ملی۔ جگن ناتھ آزاد نے ظفر کی غزل کی تضمین سنائی جس سے سامعین بہت محظوظ ہوئے۔ جمیل مظہری نے ظفر کی روح کی فریاد بڑے دلدوز لہجے میں سنائی جس سے سامعین بہت متاثر ہوئے۔ واہی نے اپنی نظم ۱۸۵۷ء کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ نظم آزاد تھی اس میں لال قلعے کی شوکت و عظمت کا جس خلوص اور جوش سے ذکر تھا اس سے سبھی متاثر ہوئے۔ اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں لال قلعے کی مرکزیت کا سبھی کو احساس ہوا۔ راقم الحروف کی نظم میں ہندوستانی تہذیب میں مغل دور کے کارنامے کو اجاگر کیا گیا تھا۔ شمیم کرہانی، نشور واحدی، عرش، پرویز شاہدی، مظہر امام، روش صدیقی، بسمل سعیدی، جوش ملسیانی اور علی جواد زیدی کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ سکندر علی وجد، ساغر، دلاور فگار بھی بہت مقبول ہوئے۔ مشاعرہ دس بجے کے قریب شروع ہوا اور دو بجے تک جاری رہا۔ بیچ میں کچھ دیر کے لیے بجلی غائب ہوگئی تھی مگر مجمع نے بڑے ضبط و نظم کا ثبوت دیا۔

اچھا ہوتا اگر پہلے دور میں صرف موضوع پر نظمیں یا طرح پر غزلیں ہوتیں اور اسکے بعد دوسرا کلام سنایا جاتا، شروع میں تو اس کا خیال رہا، مگر کچھ دیر بعد یہ التزام قائم نہ

رہ سکا۔

موضوع کی قید یا طرح کی قید بعض اوقات شعریت کو مجروح کرتی ہے، مگر اس مشاعرے میں جن شعرا نے اپنا کلام سنایا ان کے یہاں خلوص کی وجہ سے شعریت کے جلوے بھی تھے۔ یہ بات بہر حال ثابت ہو گئی کہ کسی موضوع پر مشاعرہ ہو اور وہ موضوع اہم ہو تو اس پر اچھے شعر ہو سکتے ہیں۔

دہلی میں آج کل جیسے مشاعرے ہوتے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے یوم ظفر کا مشاعرہ خاصا کامیاب کہا جا سکتا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمیں اس سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔

اس سلسلے میں پہلی ذمے داری شعرا کی ہے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ اس تاریخی موقعے کی اہمیت کو شعرا بھی محسوس کریں گے اور اسے عام مشاعروں کی طرح نہ سمجھیں گے۔ اس موقع پر اردو کے چوٹی کے شعرا کو دعوت دی گئی تھی۔ کچھ لوگوں نے جواب ہی نہ دیا، کچھ وعدے کر کے نہ آئے، کچھ آئے تو اس موقع کے لیے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ پھر بھی اردو کے ممتاز شعرا خاصی تعداد میں ڈائس پر رونق افروز تھے۔ شروع سے اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ شعرا پڑھنے والے کے سامنے ہوں، مگر بعد میں آنے والوں کی وجہ سے یہ پابندی قائم نہ رہ سکی۔ آج کل یہ عجیب دستور نکلا ہے کہ شاعر جب اپنا کلام سناتا ہے تو اسی وقت بہت سے شعرائے کرام کو اپنے ساتھیوں سے کوئی ضروری بات کہنا ہوتی ہے، پھر اچھے اچھوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جلد سے جلد کلام پڑھ کر رخصت ہو جائیں۔ اس سلسلے میں مجھے ثاقب لکھنوی اور جگر مرادآبادی یاد آئے۔ ثاقب ایک دفعہ علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کرنے آئے۔ ان کی طبیعت اچھی نہ تھی۔ منتظمین نے ان سے کہا کہ آپ ابھی تکلیف نہ کریں، آخر میں آپ کو زحمت دی جائیگی مگر وہ نہ مانے۔ مشاعرہ شروع ہونے کے وقت پہنچے اور آخر تک بیٹھے رہے۔ یہ ہیں مشاعرے کے آداب۔ جگر مرادآبادی، کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو آخر تک ضرور بیٹھتے تھے اور اس طرح نہیں کہ دوستوں سے گپ کرتے رہیں یا خاموش رہیں، بلکہ پڑھنے والوں کا کلام واقعی سنتے تھے اور موقع موقع سے داد بھی دیتے تھے۔ آج کل تو شاعر بیچارہ جب کسی دوسرے شاعر کو باتوں میں مصروف دیکھتا ہے تو اسے خاص طور سے کسی شعر کی طرف متوجہ کرتا ہے تاکہ اس بہانے اسے راہ راست پر لے آئے۔ کوئی مشاعرہ دو چار شاعروں کے اچھے اشعار کی وجہ سے کامیاب نہیں کہا جا سکتا۔

اس میں سب کو اس طرح پڑھنے کا موقع ملنا چاہیے کہ لوگ شاعر کی طرف متوجہ ہوں اور اسکے اچھے اشعار پر مناسب الفاظ میں داد دیں۔ اب تو مصرع اٹھانے کی رسم بھی رخصت ہوتی جارہی ہے۔

پھر مشاعروں میں صدر کا رول قریب قریب غائب ہوتا جارہا ہے اور اناونسر صدر سے زیادہ اہم ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صدر زیادہ تر دی۔ آئی۔ پی (بہت اہم آدمی) ہوتا ہے، جو اتنی بھی زحمت نہیں کرتا کہ مشاعرے کے آخر تک بیٹھا رہے۔ شروع میں وہ چند کلمے کہہ دیتا ہے اور پھر پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل ہی غائب ہوجاتا ہے۔ مشاعرے کو چلانے کا بار اناونسر یا سکریٹری کے اوپر رہتا ہے۔ حالانکہ یہ کام صدر کو کرنا چاہیے اس مشاعرے میں نورالدین صاحب میئر دہلی صدر تھے، وہ کچھ دیر کے بعد چلے گئے اور راقم الحروف کو صدارت سونپ گئے۔ اناونسر کے فرائض جناب گوپی ناتھ امن انجام دے رہے تھے۔ امن صاحب کو اس کا خاصا تجربہ ہے اور انہوں نے حسن اسلوبی سے اپنا کام کیا، مگر صدر انہیں اور مدد دے سکتا تھا جو نہیں دے سکا۔

ایک اور بات یہ ہے کہ مشاعروں میں خاصی تعداد میں ایسے ممتاز افراد شرکت کرتے ہیں جو تھوڑی دیر بیٹھنا چاہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ اچھا کلام سننا چاہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے پہلے کی ترتیب کو بدلنا پڑتا ہے اس کا اثر مشاعرے کی کامیابی پر پڑتا ہے۔ اگر چند ممتاز شعرا کا کلام گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہی سننے کو مل جائے تو بہت سے لوگ چل دیتے ہیں اس سے مشاعرے میں ابتری پھیلتی ہے۔

ان باتوں کی روشنی میں ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آئندہ صدر ایسا چنا جائے جو آخر تک بیٹھ سکے اور جو خود مجمع سے شعرا کا تعارف کرائے۔ سکریٹری صرف صدر کی مدد کرے۔ جو بھی ترتیب رکھی جائے وہ کسی کی خاطر بدلی نہ جائے، کسی شاعر کو چاہے وہ کتنا ہی مقبول ہو، پہلے دور میں ایک سے زیادہ بار نہ پڑھوایا جائے۔ شعرا پہلے دور میں صرف موضوع پر نظمیں یا طرح پر غزلیں سنائیں، دوسرے دور میں جو چاہیں سنائیں۔

اگر ان باتوں کا التزام ہوجائے تو شاید سننے والے بھی زیادہ تعاون کریں گے اور مشاعرے زیادہ کامیاب ہوں گے۔ ہاں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اس دور میں کوئی

مشاعرہ تین چار گھنٹے سے زیادہ نہ چلنا چاہیے۔ اور شعرا کی جو فہرست پہلے سے بن چکی ہے اس میں عین وقت پر اضافہ نہ ہونا چاہیے۔ بعض اوقات خود ممتاز شعرا کسی کی سفارش کرتے ہیں جسے رد کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر اس سلسلے میں تھوڑی سی بے مروتی سے کام لینا اچھا ہے شاعر وہی تو نہیں ہے جو مشاعرے میں پڑھتا ہے۔ بہت سے اچھے شاعر مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے مگر ان کے کلام کی قدر کرنے والے بہت ہیں۔ پھر ایک ہی موقع پر سب باکمالوں کا مظاہرہ کیوں ضروری ہو۔

اچھا مشاعرہ وہ ہوتا ہے جس میں اچھا کلام اچھی طرح سنا جائے اور اس کے لیے انتظار بھی کیا جائے۔

ادب اور تہذیب کا بہر حال چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس سلسلے میں شعرا، سامعین، منتظمین، تینوں کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

بحیثیت مجموعی یوم ظفر کا پہلا جلسہ اور مشاعرہ دونوں اپنی مخصوص نوعیت اور تاریخی حیثیت کی وجہ سے یادگار رہیں گے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۲۲ر نومبر ۱۹۶۳ء)

صحت مند نظریہ کیا ہے؟

کوئی بیمار ہوتا ہے تو اس کا ذہن بھی مریض ہو جاتا ہے۔ ہر وقت تاریک پہلو سامنے آتا ہے۔ ذرا سی مصیبت پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ دل دھڑکنے لگے تو خیال ہوتا ہے کہ اب قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ ذرا سا شور کانوں کو سخت اور ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ خلاف مزاج ذرا سی بات ہو فوراً غصہ آجاتا ہے۔ بیماری کچھ لمبی ہو جائے تو زندگی سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ غرض جسمانی مرض کے علاوہ ذہنی مرض بھی لاحق ہو جاتا ہے۔ جسمانی مرض تو جلد ہی دور ہو سکتا ہے مگر ذہنی امراض دیر میں جاتے ہیں۔

تندرست آدمی کا رویہ دوسرا ہوتا ہے۔ تکلیف ہوتی ہے ہنس کر ٹالتا ہے۔ مصیبت پڑتی ہے تو جد و جہد کر کے دور کرتا ہے۔ حالات ناموافق ہوں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے کوئی بیماری ہو جائے تو مناسب علاج کرتا ہے مگر اس بیماری کی دھونس میں نہیں آتا۔ جسم تندرست ہوتا ہے تو ذہن بھی صحت مند ہوتا ہے اس لیے زندگی پر قنوطیت غالب نہیں آتی۔

قوموں کا بھی یہی حال ہے۔ ہم ہندوستانی بڑے پرانے، بڑے شاندار، بڑے تاریخی ملک کے رہنے والے ہیں، مگر قوم کی حیثیت سے ہم نئے ہیں اور کچھ ذہنی امراض کے شکار ہیں، ہمارے سماج میں خرابیاں ہیں۔ ہمارے نظام میں بہت سی اصلاح طلب باتیں ہیں مگر آج کسی جگہ جا بیٹھے، خواص کا اجتماع ہو یا عوام کی ٹولی، سننے میں صرف برائیاں آئیں گی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری قوم ایک مرض میں گرفتار ہے۔ وہ ہے اعتراض کا مرض۔ اگر ان اعتراضوں کو جمع کیا جائے تو ان کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہم میں کوئی

خوبی نہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ہم میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ مگر ہم صرف اپنی خوبیاں اور دوسرے کی خامیاں دیکھتے ہیں۔ حکومت نکمّی ہے۔ وزیر ناکارہ ہیں۔ غذا کے معاملے میں کتنی نالائقی ہوئی ہے۔ رشوت کا بازار کتنا گرم ہے۔ سیاست داں کیسے بے ایمان ہیں۔ یونیورسٹیوں کی تعلیم کتنی ناقص ہے۔ پولیس کتنی جاہل اور ظالم ہے۔ طلبا کتنے بے راہ ہیں۔ افسر کتنے فرعون ہیں۔ مزدور کتنے سرکش ہیں۔ سرمایہ دار کس طرح خون چوس رہے ہیں۔ فلاں سیاسی پارٹی کتنی گمراہ ہے۔ اخبار کس طرح سنسنی پھیلاتے ہیں۔ عوام کس قدر غیر ذمہ دار ہیں وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب غلط ہے۔ ان باتوں میں صحت ہے مگر سچ صرف یہی نہیں ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے جمہوریت کو اپنایا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمارے یہاں ایماندار آدمی بھی ہیں! ایسے بھی ہیں جو دوسروں کا نقطۂ نظر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو دوسرے کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو خاموشی سے ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو فرض شناس ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن میں تعصب یا تنگ نظری نام کو نہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ماضی کے سرمائے کا احساس رکھتے ہوئے آگے کی طرف دیکھ رہے ہیں! ایسے بھی ہیں جو سماج کی اونچ نیچ کو ختم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ایسے ادیب بھی ہیں جو انسانیت کے علمبردار ہیں اور قوم کا درد رکھتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جو ہر زبان کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں۔

اس لیے ہمارا فرض یہ ہے کہ آنکھ بند کر کے ہر بات پر اعتراض کرنا چھوڑ دیں۔ پہلے اپنی خامیوں پر نظر کریں اور دوسروں کی خوبیوں پر۔ پھر ہمیں حق ہوگا کہ اپنی خوبیوں پر اصرار کرتے ہوئے دوسروں کی خامیاں ظاہر کریں۔ اپنے فرائض کو ادا کرنے کے بعد ہی حقوق پر اصرار اچھا ہوتا ہے۔ حقوق پر اصرار اور فرائض سے چشم پوشی غلط ہے۔ پھر سب الزام حکومت یا اکثریت یا کسی سیاسی پارٹی یا روس یا امریکہ پر تھوپ دینا، یا ہر کمزوری کے لیے برطانوی سامراج کو مورد الزام ٹھہرانا فراریت ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔ ہم ہندوستانی نہ فرشتے ہیں نہ شیطان۔ ہم انسان ہیں اور انسانوں کی ساری خوبیاں اور ساری کمزوریاں ہم میں موجود ہیں۔ اگر خوبیوں کا احساس ہو جائے تو خامیوں کو دور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے مرض میں گرفتار ہیں یعنی انہیں سب ہندوستانی فرشتے معلوم

ہوتے ہیں اور دوسرے سب شیطان۔ یہ ایک ہی مرض کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسری قسم کی فراریت ہے۔

حقائق سے آنکھیں چار کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں اپنی طاقت کا بھی زیادہ گہرا احساس ہوگا اور اپنی کمزوری کا بھی یعنی ایک مریض نقطۂ نظر کے بجائے ایک صحت مند نقطۂ نظر اپنانا ہوگا۔ اس صحتمند اور حقیقت پسند نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بعض باتوں سے ولولہ ملے گا، بعض باتوں پر عبرت ہوگی اور ہم فرد کو تہذیب نفس سکھا کر قوم کو ترقی کی منزل تک لیجا سکیں گے جہاں یہ بات عام ہندوستانیوں کے متعلق صحیح ہے وہاں اردو دوستوں کے متعلق خاص طور پر صحیح ہے۔ اردو زبان کیساتھ حق تلفی ضرور ہوئی ہے۔ حکومت کیطرف سے بھی اور اکثریت کی طرف سے بھی۔ مگر اردو دوستوں نے سب سے زیادہ اپنی زبان کی حق تلفی کی ہے۔ انکا نظریہ چند کو چھوڑ کر یہ ہے کہ ہمارا مستقبل تاریک ہے۔ حکومت بے پرواہے اور اکثریت تنگ نظر اور ہم مجبور ہیں۔ حالانکہ صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ آج نئے ہندوستان کے نقشے میں ہر گروہ اپنی بساط کے مطابق رنگ بھر رہا ہے جو اپنا رنگ بھر رہا ہے اسے کیا پڑی ہے کہ اپنا رنگ بھرنا چھوڑ کر آپ کا رنگ بھرنا شروع کر دے جبکہ غلطی سے وہ اس رنگ کو اپنا سمجھتا ہی نہیں۔ اب آپ کا فرض کیا ہے۔ اپنا رنگ خود بھریے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کو بتائیے کہ یہ صرف آپ کا رنگ نہیں، سب کا رنگ ہے۔ اس طرح سے دوسرے بھی آپ کے کام میں شریک ہوں گے ایک سے ایک لاکھ ہوں گے اور ایک لاکھ سے ایک کروڑ۔ اور ایک کروڑ سے پینتالیس کروڑ۔ آج ہر شخص سماج کی اصلاح کے لیے سستا سا نسخہ لیے پھرتا ہے۔ فرد کی اصلاح کیجیے اور ان قدروں کو فرد کے ذہن پر ثبت کر دیجیے جو اچھے سماج کی قدریں ہیں دیکھئے سماج کی اصلاح کا عمل خود بخود شروع ہو جائے گا۔ اب وہ زمانہ لد گیا جب انقلاب کا نعرہ لگا کر لوگ فرض کر لیتے تھے کہ انقلاب کی آنچ خود بخود ذہنی اصلاح کر دے گی۔ ذہنی اصلاح کے بغیر خود انقلاب نراج کا دوسرا نام ہوگا۔ ہمارا فرض جمہوریت کی روح کو پہچاننا، فرد کو جمہوریت کی ذمہ داریوں سے آشنا کرانا، اپنی اصلاح کرنا اور اپنے عمل سے دوسروں کو راہِ راست پر لانا ہے۔ یہ راستہ لمبا ہے مگر لمبے راستے ہی بالآخر سب سے اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ ان پر چلنے والے منزل پر پہنچنے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ یکم مارچ ۱۹۶۶ء)

ہمیں ہر چیز سے مطلب ہے

یادش بخیر لکھنؤ کے کافی ہاؤس میں ایک اردو کے ادیب، اردو کے ایک شاعر سے کہہ رہے تھے:

"یار سنا ہے لیش پال ہندی کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔" دوسرے نے کہا مگر ہم سے مطلب!

آج صرف اردو والوں کا ہی نہیں، سبھی زبانوں کے جاننے والوں کا یہی حال ہے۔ سب اپنے اپنے حلقے میں مست ہیں یا ماتم گسار، دوسرے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

اس بے نیازی اور بے پروائی سے سبھی کا نقصان ہوتا ہے۔ اردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا فرض کہ وہ ہندی ادب کی رفتار پر بھی نظر رکھیں۔ ہندی میں شاعری کس طرح کی ہو رہی ہے، افسانے کیسے لکھے جا رہے ہیں، نثر کی ترقی کی رفتار کیا ہے، تنقید میں کن پہلوؤں پر خاص توجہ ہے۔ اسی طرح ہندی کے لکھنے والوں کو اردو، بنگالی، تامل اور دوسری زبانوں میں ادب کی رفتار پر نظر رکھنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ہم ایک زبان کے جاننے والوں کو دوسری زبان کے جاننے والوں سے قریب کر سکیں گے۔ ایک زبان کے اچھے اور معنی خیز تجربوں اور کارناموں سے فائدہ بھی اٹھا سکیں گے اور پھر سب کو ہندوستانی ادب میں اور اس کے ذریعہ سے ہندوستانی تہذیب میں ایک حیرت انگیز وحدت کا احساس ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ ضروری ہے۔ اگر آپ اپنی زبان

کے حقوق منوانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تو آپ کا فرض ہے اور اس فرض کے ادا کرنے پر آپ اپنے ضمیر کو مطمئن کر سکتے ہیں مگر اس پر شیخی مارنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ضروری یہ ہے کہ آپ ہر زبان کے حقوق منوانے میں مدد دیں۔ ہندی کے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اردو کے حقوق کو منوائیں اور بنگالی اور تامل کے بولنے والوں کو بھی سنیں۔ اردو کے ادیبوں کا فرض ہے کہ جہاں وہ کسی ہندوستانی زبان کے ساتھ زیادتی دیکھیں، اس پر احتجاج کریں۔ جب کسی قومی زبان کی ترقی میں رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں تو نقصان صرف اس زبان کے جاننے والوں کا نہیں پوری قوم کا ہوتا ہے۔ اس طرح جب کسی زبان میں کوئی ادبی شاہکار وجود میں آتا ہے تو سبھی زبانوں کے ادب پر اس کا گہرا اثر پڑ سکتا ہے اور پڑنا چاہیے۔

دوسری زبانوں کے علاوہ ہمیں دوسرے کاموں سے بھی سروکار رکھنا ہے۔ سائنس کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے فنون لطیفہ کی ترقی کی رفتار کیسی ہے۔ سیاست کدھر جا رہی ہے۔ اقتصادی حالات کیا ہیں۔ جمہوریت کے ساتھ جمہوریت کے ماننے والے کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کیوں اپنے مقاصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں حاصل کر رہی ہے۔ کھیتوں سے بھوک کیوں اگ رہی ہے۔ لوگ ذرا ذرا سی بات پر بسیں، ریل کے ڈبے، ڈاک خانے کیوں جلانے لگتے ہیں۔ طلبہ کیوں بے راہ ہو رہے ہیں۔ تعلیم کا معیار کیوں گر رہا ہے۔ آج ہر وہ شخص جو آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور جس کے پاس ضمیر کے نام کی کوئی چیز ہے کیوں دل شکستہ اور مرجھایا ہوا ہے۔

یعنی ہمارا ذہنی افق جتنا وسیع ہوگا۔ ذات میں ہم جس قدر کائنات کا جلوہ دیکھیں گے، اتنا ہی ہم پر واضح ہوگا کہ وہ اردو کا مسئلہ ہو یا گرانی کا، منصوبہ بندی کی کامیابی کا سوال ہو یا آبادی کے روکنے کا، ہمیں ایک قومی اور جمہوری اور مہذب نقطۂ نظر پیدا کرنا ہوگا۔ حقوق سے پہلے فرائض کو نبھانا ہوگا۔ چیزوں کو مناسب پس منظر میں دیکھنا ہوگا۔ اردو کی ترقی کے لیے اور زیادہ ہندوستانی ہونا اور ہندوستانی ہونے کے لیے اور عالمی ہونا پڑے گا۔ ادب کی ترقی کے لیے سائنس کے جدید ترین انکشافات

کا علم حاصل کرنا پڑے گا۔ مشرقی علوم کو سمجھنے کے لیے مغرب سے بھی کچھ معیار لینے ہوں گے اور مغربی معیاروں کے علم کے ساتھ مشرق کی روح کو بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا پھر ہمیں یش پال سے بھی مطلب رکھنا پڑے گا اور اس پر اصرار بھی کرنا پڑے گا جدید ذہن کو سمجھنے کے لیے فیضؔ و فراقؔ، ملّا و بیدی کا مطالعہ ہر زبان کے ادیب کو کرنا چاہیے۔ کبھی اپنے کو سمجھنے کے لیے دوسرے کی نظر بھی مانگنی پڑتی ہے اور دوسرے کے دل میں جھانکنے سے اپنا درد و کرب اور سوز و گداز بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۱۵ اپریل ۱۹۶۶ء)

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

جب دو جیالے امریکن ہوا باز وں آرمسٹرانگ اور ایلڈرن نے چاند کی سرزمین پر پہلا قدم رکھا تو انسانیت کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہو گیا انسان نے خلا کو تسخیر کر کے زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور چاند تک پہنچ کر یہ ثابت کر دیا کہ اس کے عزم و ہمت کے سامنے فطرت کی ساری طاقتیں سرنگوں ہو سکتی ہیں۔ یہ عظیم الشان اور تاریخی کارنامہ صرف دو امریکن ہوا بازوں ہی کا نہیں، سائنس، انجینئرنگ انسان کی جدوجہد اور محنت اور مہارت کا بھی ہے۔ اس پر امریکہ کو ہی نہیں ساری دنیا کو فخر ہے اور سب اس خراج عقیدت میں شریک ہیں خلا کی تسخیر کی یہ پہلی منزل ہے ابھی کتنے ہی سیارے اور چاند انسان کے قدم کے منتظر ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس مہم پر جو اربوں روپیہ خرچ کیا گیا ہے وہ دوسرے مفید کاموں میں صرف ہو سکتا تھا وہ انسان کی فطرت سے ناواقف ہیں میلوری سے جب یہ سوال کیا گیا کہ تم ایورسٹ پر کیوں چڑھنا چاہتے ہو تو اس نے جواب دیا "اس لیے کہ وہ ہے" چاند پر پہنچنا انسان کے لیے ضروری تھا وہ چاند ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس روپیہ کو سمندر کی تہ کے اسرار دریافت کرنے اور متبادل غذا دریافت کرنے کے لیے صرف کرنا چاہیے تھا یا اسے کینسر جیسے موذی مرض کا علاج دریافت کرنے میں لگانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام بھی ضروری ہیں اور ان کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، مگر انسان کی فطرت عجیب و غریب ہے وہ صرف نفع و نقصان، مفید اور مضر اچھے اور بڑے کے چکر میں

گرفتار نہیں رہتا بلکہ ہر بلندی تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانا چاہتا ہے۔ آسمان سے تارے توڑنا چاہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ستاروں کی گذرگاہوں کا ڈھونڈنے والا ابھی زندگی کی شب تاریک کو سحر نہیں کرسکا ہے۔ ابھی اس نے اپنی تخریبی جبلتوں پر قابو پانا نہیں سیکھا، ابھی قتل اور غارت گری اور ظلم اور بربریت سے رہائی حاصل نہیں کرسکا۔ ابھی رنگ، نسل، علاقے، زبان، مذہب، ذات پات، آئڈیالوجی نے اس کو ٹولیوں اور گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ مگر تخریب اور تشدد کے ساتھ تعمیر اور امن پسندی کی قوتیں بھی کام کر رہی ہیں زندگی انہی تضادات اور عجائبات کا نام ہے۔ انسان نے سائنس سے تباہ کاری کا بھی کام لیا ہے مگر اس کی وجہ سے سائنس کو الزام دینا غلط ہے۔ اس طرح ہوسکتا ہے کہ چاند تک پہنچنے کی یہ مہم، فضا اور خلا کو اپنی ملک گیری کی ہوس کا آلہ بنانے کا ذریعہ بن جائے۔ بجلی سے گھر اور بازار روشن بھی ہوتے ہیں اور بجلی کے تار سے چپک کر لوگ مرتے بھی ہیں جیسے جیسے انسان آگے بڑھتا جائے گا نئے نئے خطروں سے بھی دوچار ہوگا۔ نئے نئے امراض بھی پیدا ہوں گے اور ان امراض کے علاج بھی۔ انسان ہر لحظہ نئے طور کی جستجو کرتا رہے گا اور اس کا مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہوگا۔

رہی بات کہ چاند کی میلی، مٹیالی، بنجر، بے جان فضا کے علم کے بعد چاند کے متعلق شاعری بیکار ہوجائے گی تو یہ بات بھی صحیح نہیں۔ چاند کا حسن اس جلوے میں ہے جو ہمیں نظر آتا ہے دوری حسن ہے چاند ایک علامت تھی۔ جب یہ علامت بیکار اور فرسودہ ہوجائے گی تو شاعر نئی علامات وضع کرے گا۔ بہرحال چاند کا علم، اس کی چٹانوں کا علم فضا میں کون و فساد کے بہت سے سلسلوں کا علم ہمیں دے گا اور دوسرے اجرام فلکی تک پہنچنے کے لئے اس سے مدد ملے گی۔ اقبال نے ٹھیک کہا تھا ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

ساہتیہ اکاڈمی کا سیمنار

ساہتیہ اکاڈمی کی طرف سے تین چار اگست کو ان زبانوں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک سیمنار ہوا، جو کسی ریاست کی سرکاری زبان نہیں ہیں۔ اس سیمنار میں سنسکرت، اردو، سندھی اور میتھلی کے مسائل پر بحث ہوئی۔

سیمنار کا افتتاح کرتے ہوئے صدر اکاڈمی ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی نے تمام زبانوں کے ساتھ انصاف کرنے پر زور دیا۔ انہوں نے کہا چونکہ ساہتیہ اکاڈمی تمام ہندوستانی ادبیات کا فروغ چاہتی ہے اس لیے اس کا فرض ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے حقوق کا تحفظ کرانے کی فضا پیدا کرے، جن کے ساتھ کسی نہ کسی وجہ سے تغافل برتا گیا ہے۔

سب سے پہلے ڈاکٹر مہیشور نیوگ نے سنسکرت، اردو اور سندھی کے سلسلے میں اعداد و شمار کی مدد سے بعض حقائق پیش کیے۔ اس کے بعد اڑیسہ میں سنسکرت کی تعلیم پر پروفیسر کے۔ بی واش نے ایک معلوماتی مضمون پڑھا۔ وی۔ ڈی گھٹے نے ہماری قومی زندگی میں سنسکرت کے عنوان سے اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر راگھوون، پروفیسر ویش پانڈے، ڈاکٹر آئینگر اور دوسرے حضرات نے بحث میں حصہ لیا۔ بحث کے بعد پروفیسر راگھوون نے سیمنار کی طرف سے سنسکرت کی تعلیم کے متعلق کچھ سفارشات پیش کیں۔

سہ پہر کے اجلاس میں پروفیسر مجیب نے اردو کے متعلق ایک تقریر کی۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اردو بولنے والے اردو کے لیے خود کم کام کرتے ہیں دوسروں سے زیادہ توقع رکھتے ہیں انہوں نے کہا کہ اگر اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں ہوتا

تو گھر پر اسے پڑھانا چاہیے۔ انہوں نے بالغوں کی تعلیم کے لیے اچھی کتابوں کی کمی کی طرف اشارہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ اردو کے ذریعہ سے ابتدائی اور ثانوی منزل پر تعلیم کا مناسب انتظام ہونا چاہیے اور یونیورسٹی کی منزل پر اسے ایک اختیاری ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے چلانا چاہیے، انہوں نے ذاتی طور پر رومن رسم خط کی حمایت کی، مگر یہ تسلیم کیا کہ عام جذبہ موجودہ رسم خط کے حق میں ہے۔

راقم الحروف نے اپنے مقالے میں اردو کی ہندوستان گیر حیثیت کی طرف اشارہ کیا اور اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ غیر ہندی ریاستوں میں عموماً اردو کے حقوق کو برابر پامال کیا جا رہا ہے اور اس لحاظ سے اتر پردیش میں صورت حال سب سے زیادہ قابل اعتراض ہے۔ راقم الحروف نے اعداد و شمار کی مدد سے ثابت کیا کہ ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ دینے کی اتر پردیش میں جو کوشش ہوئی ہے وہ کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہی جا سکتی جب کہ اس سے بہت کم اردو داں آبادی ریاستوں میں ابتدائی منزل پر اردو پڑھنے والوں کی شرح اتر پردیش سے بہت زیادہ ہے۔

راقم الحروف نے خاص طور سے ثانوی منزل پر تعلیم کی سہولت نہ ہونے کی مذمت کی راقم الحروف نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو ادب کی اہمیت کو آزادی کے بعد تسلیم کیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت اور یونیورسٹیاں اور ساہتیہ اکادمی اردو ادب کا مناسب اعتراف کرتے ہیں، مگر جب تک زبان کی تعلیم اور چلن کا تحفظ نہیں ہوتا ادب کی یہ ترقی کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ زبان کی بقا اگر خطرے میں ہو تو ادب بھی پنپ نہیں سکتا آخر میں دوسری زبانوں کے ادیبوں سے یہ اپیل تھی کہ وہ اردو زبان کی بقا اور تحفظ کو ایک قومی اور ادبی فریضہ سمجھیں اور زبان کے مسئلے کو سیاست دانوں کی فٹ بال نہ بننے دیں۔

رسم خط کا ذکر کرتے ہوئے راقم الحروف نے اردو رسم خط کو کچھ اصلاحوں کے ساتھ جو تعلیمی اور تدریسی ضروریات کی وجہ سے اہم ہیں، باقی رکھنے پر زور دیا۔ ہاں اردو کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے دیوناگری رسم خط میں بھی کتابیں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے اپنے مقالے میں اردو کے لیے دستوری تحفظات کی سفارش کی۔

پروفیسر دیب، ڈاکٹر دیش پانڈے، ڈاکٹر مینا کشی سندرم اور دوسرے حضرات نے بحث میں حصہ لیا۔ اردو کے سلسلے میں سیمنار کی سفارشات حسب ذیل تھیں۔

(۱) چونکہ ہماری آزادی کو اب بائیس سال ہونے آئے اس لیے سیمنار کی رائے میں دستور میں لسانی اقلیتوں کے لیے جو تحفظات ہیں ان کا موجودہ تجربے کی روشنی میں پھر سے جائزہ لیا جائے۔

(۲) سیمنار کی رائے میں دستور کی دفعہ ۲۹ الف، ۳۴۵، ۳۴۷ اور ۳۵۰ الف میں جو ہدایات درج ہیں ان کی پوری پوری پابندی ہو۔

(۳) ہر ریاست کا فرض ہے کہ وہ لسانی اقلیتوں کے لیے ان کی زبان میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا ویسا ہی بندوبست کرے جیسا اکثریت کے لیے کیا گیا ہے۔

(۴) اس مقصد کے لیے تمام مضامین اور تمام درجوں کے لیے مناسب درسی کتابوں اور سند یافتہ استادوں کا مناسب انتظام ضروری ہے۔

(۵) جہاں ضرورت ہو یونیورسٹی کی منزل پر اردو کو بھی اختیاری ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے استعمال کیا جائے۔

(۶) سہ لسانی فارمولے میں سب سے پہلے مادری زبان کو جگہ ملنی چاہیے۔

(۷) زبان کے متعلق موجودہ رویے میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور طلبا کو کئی زبانیں جاننا چاہئیں۔

(۸) ایم اے میں جدید ہندوستانی زبانوں کے نصاب میں اصل زبان کے ساتھ کسی اور جدید ہندوستانی زبان یا کلاسیکی زبان کے پرچے بھی ہوں۔

(۹) لسانی اقلیتوں کے کمشنر کی رپورٹ ریاستی مجالس قانون ساز کو بھی بھیجی جائے اور وہاں اس پر اظہار خیال ہو۔

(۱۰) اردو کی کتابیں دیوناگری رسم خط میں بھی شائع کی جائیں تاکہ اور زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔

سندھی زبان کے مسائل کے متعلق ڈاکٹر سدارنگنی نے ایک مقالہ پڑھا اور حکومت ہند اور ریاستی حکومتوں کے تغافل کی شکایت کی۔ ڈاکٹر جے رام داس دولت رام نے بھی اظہار خیال کیا اور سندھی کے لیے دیوناگری رسمِ خط اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

سیمنار کی رائے یہ ہوئی کہ موجودہ عربی رسم خط کے ساتھ دیوناگری رسم خط بھی استعمال کیا جائے۔

ڈاکٹر رام ناتھ جھانے میتھلی زبان کے حقوق کی پامالی پر مقالہ پڑھا۔ مجموعی طور پر اس سیمنار کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں بہت سی زبانوں کا رائج ہونا ایک لعنت نہیں رحمت ہے۔ اس سے اس کے سرمائے کی رنگینی اور ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ ساری ہندوستانی زبانوں کے سرمایہ کی حفاظت اور ان زبانوں کی ترقی کی حمایت کرے تاکہ ان کا ادب پورے ملک کے لیے ذہنی اور جمالیاتی غذا کا باعث ہو۔

ہر چیز کی قیمت ادا کیجیے

ہم ہندوستانیوں کے متعلق کسی سر پھرے نے بڑی دلچسپ بات کہی تھی یہ لوگ کچھ نہ کچھ یونہی حاصل کرنا چاہتے ہیں (Something for Nothing) اس بات میں مبالغہ ہو سکتا ہے مگر کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہے۔ اردو دوستوں پر تو بڑی حد تک یہ بات صادق آتی ہے۔ عام طور پر اردو دوست سمجھتے ہیں کہ حکومت، اکثریت، سیاسی پارٹیوں، لیڈروں پر سب کچھ فرض ہے ان کو انفرادی طور پر کچھ نہیں کرنا ہے۔ اردو کے ادیب چاہتے ہیں کہ ان کی کتابیں خوب بکیں مگر وہ خود بہت کم کتابیں خریدتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے کتاب رائے کے لیے بھیجی جائے اور وہ رائے دے یا نہ دے ناشر اور دوسرے ادیب اسے کتابیں بھیجتے رہیں وہ لوگ جو سرکاری افسر ہیں یا تاجر ہیں اردو کے ادیبوں کے سامنے اردو سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں اور اس دلچسپی کی وجہ سے اپنا حق سمجھتے ہیں کہ انہیں کتابیں یا رسالے پڑھنے کے لیے دیے جائیں۔ اردو کا دانشور طبقہ زیادہ تر انگریزی اخبار خریدتا ہے اردو اخبار مانگ کر پڑھ لیتا ہے اردو کے بہت سے ادیبوں، معلموں اور ناشروں کو ہم جانتے ہیں جن کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں اور وہ یہ بتاتے ہوئے بالکل شرم محسوس نہیں کرتے کہ ان کے بچے یا تو بالکل اردو نہیں جانتے یا برائے نام جانتے ہیں۔ بیشتر والدین حکومت یا اکثریت کی اردو دشمنی کا رونا روتے ہیں، مگر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے بچے کو اردو کم سے کم ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائیے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وہ انجینئرنگ کے لیے اسے تیار کر رہے ہیں یا ڈاکٹر بنانا چاہتے ہیں

ایسی اونچی اڑانوں میں غریب اردو کا کیا ذکر، ایسے لوگوں کو بھی ہم جانتے ہیں جو ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر اردو کے لیے بھوک ہڑتال اور جان کی قربانی کی بات کرتے ہیں مگر اس خیال سے سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کے انتظام کے لیے درخواست نہیں دیتے کہ اس سے پرنسپل یا استاد لڑکے کے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ آج کی صحبت میں چند بنیادی حقائق کی طرف توجہ دلائی جائے تاکہ ہماری زبان کے پڑھنے والے اس پر سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

اگر اردو ہماری زبان ہے اگر اسمیں ہماری تہذیب، ہماری تاریخ، ہماری امنگوں اور آرزوؤں، ہماری قومی شخصیت اور ہمارے جمالیاتی، اخلاقی، سماجی اقدار کی کہانی درج ہے، اگر اس کے ذریعہ سے ہم خیال کی بلندی، جذبے کی گہرائی، احساس کی نزاکت، روح کی پرواز، شوق کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں تو پھر اس کی بقا اور ترقی ہم پر فرد کی حیثیت سے کسی حد تک فرض ہے اور ہم یہ فرض کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اردو زبان ہمارے گھر کی لونڈی ہے جس کا کام رات دن ہماری خدمت کرنا ہے اور جس کے لیے ہمیں صرف روٹی، کپڑا مہیا کرنا ہے تو دوسری بات ہے لیکن اگر اس زبان کا تعلق ہماری سیرت و شخصیت کی تعمیر سے گہرا ہے اور اگر اس کے بغیر ہم اپنی صلاحیتوں کی تکمیل نہیں کر سکتے۔ تو پھر ہمیں اس کی بقا اور ترقی کے لیے خود کچھ کرنا پڑے گا۔ خود کچھ کرنے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ ہم زندگی کے سارے کاروبار چھوڑ کر اردو کی بقا اور ترقی کے لیے جد و جہد شروع کر دیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنے اوپر یہ لازم کر لیں کہ جس طرح ہم اپنا کچھ وقت اور کچھ توجہ اور کچھ روپیہ زندگی کے دوسرے کاموں پر صرف کرتے ہیں اسی طرح اس کا کچھ نہ کچھ حصہ اردو پر بھی صرف کریں۔ پھر اس صرف کے بھی کئی طریقے ہیں۔ ہم اردو کے اداروں کے کاموں میں مدد کے لیے کچھ وقت نکالیں ہاں ہم اپنی دلچسپی اور صلاحیت کے اعتبار سے اس کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہم اپنے بجٹ کا کچھ حصہ اپنے مقدور کے مطابق اردو کی کتابوں رسالوں اور اخباروں کی خریداری پر صرف کریں۔ پھر ہم اس بات کو لازم کر لیں کہ ہم اپنے بچوں کو ہر حال میں اردو پڑھائیں گے اور اس کے لیے پہلے تو جو سہولتیں حکومت کی طرف سے دی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھائیں گے، اور اگر یہ کسی وجہ سے نہیں ہو سکتا تو دوسرے اردو دوستوں کے ساتھ مل کر اردو کے اسکول اپنے

علاقے میں چلائیں گے۔ اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہوا تو خود کچھ وقت نکال کر اپنے بچوں کو نہ صرف اردو پڑھائینگے بلکہ انہیں اردو پر فخر کرنا سکھائیں گے یعنی اگر ہمیں اردو سے محبت کا دعویٰ ہے تو ہمیں اس محبت کی قیمت ادا کرنا چاہیے۔ خالی خولی محبت کا اظہار بے معنی ہے۔

ہمارے یہاں عشق کا بھی عجیب تصور ہے۔ اگر کوئی کسی پر عاشق ہوگیا تو وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے محبوب پر بڑا احسان کیا ہے۔ اسے اب کچھ نہیں کرنا ہے اگر محبوب اس کے عشق کا جواب عشق سے نہیں دیتا تو وہ ظالم اور سفاک ہے۔ وہ اپنے حسن کے نشے میں سرشار ہے وہ خالص محبت کی قدر نہیں کرتا بلکہ مال و دولت کی قدر کرتا ہے۔ عشق کا یہ رومانی بلکہ مریض تصور زبان و ادب کے سلسلے میں بھی نظر آتا ہے۔ اگر ہم کو اردو زبان سے محبت ہے۔ اگر ہم انگریزی جیسی شاندار زبان یا موجودہ حالات میں کام آنے والی سرکاری زبان کے ہوتے ہوئے اردو جیسی غیر نفع بخش زبان کی بات کرتے ہیں، اس کی ترقی کی خواہش کرتے ہیں اس کی حمایت میں تقریر کرتے ہیں تو یہ کیا کم ہے۔ ہمیں زندگی میں کامیاب ہونا ہے۔ ہمیں سماجی مرتبے کی اگلی سیڑھی پر چڑھنا ہے اسلیے اردو کے لیے عملی طور پر کچھ کرنا یا اس پر روپیہ خرچ کرنا کیا ضرور!

خدا بخشے اکبر الہ آبادی کو انہوں نے مسلمانوں کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا، یہ بیشتر اردو دوستوں پر بھی صادق آتا ہے:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو ایک فرضی لطیفہ — کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہوگیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفا مرا با حسرت و یاس

جنگ آزادی یا غدر

ایک طرف ۱۸۵۷ء کی شورش کی یادگار منانے کے لیے عوام اور حکومت پروگرام بنا رہے ہیں دوسری طرف کچھ مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ محض سپاہیوں کی بغاوت تھی اور اس کے پیچھے کوئی قومی جذبہ یا ملکی تحریک نہ تھی۔ ابھی حال میں ڈاکٹر آر سی مجمدار کی کتاب کے متعلق کچھ خبریں اور کچھ تبصرے شائع ہوئے ہیں ڈاکٹر صاحب کی رائے پر صحیح تنقید تو کتاب دیکھ کر ہی کی جا سکتی ہے مگر تبصروں سے ان کی رائے کا کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ بہادر شاہ، نانا صاحب، رانی جھانسی یا تانتیا ٹوپی قومی ہیرو نہیں کہے جا سکتے ان لوگوں نے حالات سے مجبور ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ شورش زیادہ تر سپاہیوں تک محدود تھی۔ جس میں آخر میں کچھ فوجی افسر اور کچھ بددل راجہ یا نواب شامل ہو گئے تھے اور نہ سکھ اس سے علیحدہ رہے بلکہ بنگال، بہار، اتر پردیش، دہلی اور پنجاب کے کچھ حصے کے سوا باقی ملک کے باشندے انگریزوں کے ساتھ رہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس ہنگامے کے پیچھے کوئی باقاعدہ سازش یا سوچی سمجھی اسکیم بھی نہ تھی۔ غرض وہ اس شاندار واقعے کو صرف ایک محدود شورش یا بغاوت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت تک وہ قومی شعور پیدا نہیں ہوا تھا جو انیسویں صدی کے آخر کا عطیہ ہے لیکن انگریزوں کے خلاف نفرت کافی نمایاں تھی۔ اول تو وہ ریاستیں بددل تھیں جن کا زبردستی برطانوی حکومت میں انضمام ہو گیا تھا پھر انگریزی افسروں کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ بڑا نارواتھا۔ سر سید نے "اسباب بغاوت ہند" میں اس کی تشریح کی ہے نیز علمائے مذہبی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے انگریزی حکومت کو برا سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی دولت انگلستان

پہنچ رہی تھی اور ملک مفلس ہو رہا تھا۔ دیسی ریاستیں اگرچہ بدانتظامی کا شکار تھیں مگر وہ ایک تہذیبی رول بھی ادا کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ ایک وفاداری کا جذبہ بھی قدرتی طور پر موجود تھا اس لیے جب یہ بیزاری کارتوسوں کے واقعے سے پھوٹ پڑی تو اسے مناسب ہوا اور فضا مل گئی اگر ہندوستانی آپس میں بٹے ہوئے نہ ہوتے، اگر انگریزوں کو بجائے ایک ایک کر کے ہر مورچہ فتح کر کے دہلی کے باغیوں کی متحدہ طاقت سے مقابلہ کرنا پڑتا، اگر باغیوں کی قیادت زیادہ ذہین، باقاعدہ اور متحد ہوتی تو شاید حالات دوسرے ہوتے۔ بہادر شاہ، رانی جھانسی، نانا صاحب، یا تانتیا ٹوپی ہیرو نہ سہی مگر انہوں نے بہرحال ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ ان کے ساتھ مقامی، تہذیبی اور تاریخی روایات تھیں ان روایات نے انہیں اس طوفان میں نمایاں حیثیت دے دی۔ باغی سپاہیوں نے بلاشبہ بعض مقامات پر بڑی بربریت کا مظاہرہ کیا مگر انگریزوں نے جو ایک مہذب قوم کہلاتے ہیں اس کے جواب میں جو کچھ کیا وہ بھی بڑا شرمناک ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے واقعات کو آج کے معیاروں سے نہ دیکھنا چاہیے بلکہ اس زمانے کے رجحانات کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ شورش ناکام رہی مگر اس کی وجہ سے ہندوستانی قوم کا تصور ابھرا۔ اسی نے بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کو محض مذہبی بنیادوں سے بلند ہو کر سیاسی مقاصد کی خاطر متحد ہونے کا درس دیا۔ اس نے یہ دکھا دیا کہ عوام اگر جوش میں آجائیں تو کیا قیامت برپا کر سکتے ہیں اس لیے اس واقعے کی یادگار منانا اور اس سے اپنی قومی اور ملکی جدوجہد کی تاریخ شروع کرنا بالکل فطری ہے۔ تاریخ صرف واقعات کی کھتونی کا نام نہیں ہے ان واقعات کے پیچھے جو اثرات چھپ کر رنگ دکھاتے ہیں ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس جائزے میں چند واقعات کی صحت کرنا کافی نہیں پوری تاریخ کے بہاؤ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ مئی ۱۹۵۷ء)

تقریروں کا مرض

ہمارے ملک میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ لوگ تقریریں زیادہ کرتے ہیں، کام کم۔ لیڈروں کا تو خیر یہ پیشہ ہے وہ باتیں نہ بنائیں تو ان کی گاڑی کیسے چلے لیکن عام لوگوں کو بھی تقریریں کرنے یا سننے میں بڑا مزہ آتا ہے جہاں کوئی مشہور آدمی آیا یا کسی لیڈر یا قومی رہنما کا جنم دن ہوا یا کسی مشہور واقعے کی یادگار منانے کا فیصلہ ہوا۔ سارے ملک میں تقریروں کا ایک سیلاب پھوٹ پڑتا ہے۔ تقریروں کا مرض ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے لوگ پھر موضوع کو نہیں دیکھتے کمالِ فن کی داد دینے لگتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی شعبدہ بازی ہے اس سے عمل کی قوت مجروح ہوتی ہے۔ تقریر کے اس مرض کی وجہ سے لوگوں میں ذمے داری اور صحت کا احساس کم ہوگیا ہے۔ وہ توازن کھو بیٹھے ہیں۔ ذرا سی بات ان کے لیے قیامت ہوجاتی ہے۔ ذرا سا کام، کارنامہ بن جاتا ہے۔ بونوں کو دیوپیکر قرار دے دیا جاتا ہے ذرا سی گلے بازی سے ہیرو بن جاتے ہیں۔ اچھے سے اچھے خاموش تعمیری کام کی طرف لوگ متوجہ نہیں ہوتے۔ اسٹیج کے مداریوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ جو لوگ خلوت میں خونِ دل سے چراغ جلاتے ہیں ان کی مدھم روشنی کوئی نہیں دیکھتا، جو ڈرائنگ روم یا چوراہے یا پارک میں تیغ زبان کے جوہر دکھاتے ہیں ان کی چمک سے لوگوں کی آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔ ایک آزاد ملک کے لیے یہ ذہنی بچپن باعث شرم ہے اور جتنی جلد ہم اس بچپن سے نکل سکیں اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۲۲ مئی ۱۹۵۷ء)

کچھ اپنے متعلق

ساڑھے تیرہ برس سے میں "ہماری زبان" کے لیے اداریہ لکھ رہا ہوں۔ اس طویل عرصہ میں شاید مشکل سے دس بارہ دفعہ ایسا ہوا ہوگا کہ میں کسی طویل سفر کی وجہ سے ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لیے کچھ نہ لکھ سکا ہوں۔ اس عرصہ میں، میں نے جو اداریے لکھے ہیں ان میں اردو زبان و ادب کے مسائل کے علاوہ تہذیب، تعلیم، قومی زندگی، علم و فن کے بہت سے پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اہم اشخاص یا واقعات پر بھی رائے زنی کی گئی ہے اور قابل قدر میلانات کی طرف بھی اشارے ہوئے ہیں۔ ان میں یادیں بھی ہیں خواب بھی اور فکر و نظر بھی۔ یہ میرے پڑھنے والوں کا کام ہے کہ ان تحریروں کی خوبی یا خامی کا فیصلہ کریں، میرا کام تو انہیں ان باتوں کی طرف توجہ دلانا ہے جنہیں میں کسی نہ کسی وجہ سے اہمیت دیتا ہوں۔

اس عرصہ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں لکھنے سے پہلے دیر تک یہ سوچتا رہا ہوں کہ اب کے کس موضوع پر اظہار خیال کروں۔ ایسے مواقع پر مجھے اکثر انشاء کا خیال آتا ہے جنہیں ہر روز نواب سعادت علی خاں کو دو لطیفے سنانے پڑتے تھے۔ روایت یہ ہے کہ اسی قید نے انہیں دیوانہ بنا دیا نہ جانے میرا کیا حشر ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آدمی فطرتاً تنوع پسند ہے، بنی اسرائیل من و سلویٰ سے اکتا گئے تھے۔ اور کھیرے، لکڑی، لہسن اور پیاز اور مسور کی دال تک کی آرزو کرنے لگے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ اداریے من و سلویٰ نہیں تھے اور ہوتے بھی تو ان سے بھی ایک عرصے کے بعد بور ہو جانا بالکل فطری بات ہوتی۔ اس لیے میں ہماری زبان پڑھنے والوں کو یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ اب ایک طویل مدت کے لیے انہیں میرے اداریوں سے نجات رہے گی۔ مجھے شگاگو یونیورسٹی نے چھ

مہینے کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی ہے اور یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء تک میں، وہاں اردو ادب، غالب اور اقبال پر لکچر دوں گا اور سیمنار لوں گا۔ اس کے علاوہ امریکہ کی کچھ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی لکچر دینے اور وہاں کے دانش وروں اور عالموں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملے گا۔ میری درخواست پر میری عدم موجودگی میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انجمن کے جنرل سکریٹری اور ہماری زبان اور اردو ادب کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دیں گے۔ مجھے اطمینان ہے کہ اس عرصے میں انجمن کے سارے کام ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں رہیں گے جس کی علمیت، ادبی ذوق، لسانیاتی معلومات، تعلیمی تجربے، متوازن شخصیت اور سنجیدہ مزاج کو خاص و عام سبھی تسلیم کرتے ہیں۔)

ہمارے ملک میں اس وقت بڑی بے چینی ہے۔ ایک بڑی تبدیلی کی خواہش مختلف صورتوں میں ظاہر ہو رہی ہے یہ ایک عالمی میلان ہے، مگر ہمارے ملک میں اس کی خاص شکلیں بھی ہیں۔ آئے دن کے یہ جھگڑے، طلبا کے ہنگامے، قانون اور امن کی طرف سے بڑھتی ہوئی بے پروائی، ہر طرح کی آئڈیالوجی سے بھڑکنا، حقوق پر اصرار، بوڑھوں اور نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی خلیج، اخلاق کے اب تک کے نظریات میں شک و شبہ، صنعتی زندگی کی طرف دوڑ اور ساتھ ساتھ صنعتی زندگی کے پیدا کردہ مسائل سے خوف، پرانے سہاروں کا ٹوٹنا اور نئے سہاروں کی طرف نظر، موجودہ سیاسی پارٹیوں کی ناعاقبت اندیشی اور اقتدار پرستی اور ارباب نظر کی حقیقی سیاست کی جستجو، بڑھتی ہوئی گرانی، بے روزگاری آبادی کے مسائل، کچھ زبانوں کی ترقی اور کچھ زبانوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں، علاقائیت، لسانی عصبیت، فرقہ پرستی کی لہریں اور اس کے ساتھ کچھ حساس اور بیدار ذہنوں میں یہ امنگ کہ کسی طرح ملک اس چکر سے نکلے اور جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم کے راستے پر مضبوطی سے گامزن ہو۔ ٹیگور نے کہا تھا جب آپ اپنی قالین کو جھاڑیں گے تو پہلے گرد ضرور اڑے گی۔ کاش یہ گرد بھی اسی قسم کی ہو اور ہماری قالین کے حقیقی نقش و نگار اجاگر ہو سکیں۔ اس وقت ہم سب کا فرض یہ ہے کہ ملک میں جو لہر، جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کو مضبوط بنانے کی چلی ہے، اس کا ساتھ دیں اردو دوستوں کے لیے تو یہ اور بھی ضروری ہے کیونکہ جس رفتار سے ملک میں جمہوریت

کی بنیادیں مضبوط ہوں گی، سیکولرزم کو فروغ ہوگا اور سوشلزم کی طرف قدم بڑھے گا۔ اسی رفتار سے تمام قومی زبان کے ساتھ انصاف کا جذبہ ترقی کرے گا۔ آج بھی اردو کے ساتھ بے انصافی عام ہے مگر اب حکومت اور اکثریت کو اس بے انصافی کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ امید بندھتی ہے کہ آگے چل کر اردو کے لیے فضا بہتر ہو جائے گی۔ اردو دوستوں کا اس منزل پر فرض یہ ہے کہ وہ تعمیری کاموں کی طرف توجہ کریں خود اردو کے لیے کچھ کرنے کی عادت ڈالیں اردو کے قومی رول اور قومی کردار کو واضح کرتے رہیں۔ ملک و قوم کے دکھ سکھ میں شریک رہیں اور اپنے حقوق پر اصرار کے ساتھ اپنے فرائض بھی پورے کرتے رہیں یہ وقت مایوسی اور بددلی کا نہیں ہے۔ نہ حالات کا ماتم کرنے کا ہے۔ تبدیلی کی جو فضا پیدا ہوئی ہے اس کو نئے عزم اور ولولے کے ساتھ اپنے لیے سازگار بنانے کا ہے سچ ہے۔ ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

ہندوستان میں رائے عامّہ

کیا ہمارے ملک میں واقعی کوئی رائے عامہ ہے؟ یہ رائے ہے یا تعصبات، جذبات اور توہمات کا ملغوبہ؟ کیا یہ چند آدمیوں کی رائے ہے یا واقعی عام خیالات کا عکس ہے کیا عام خیالات اور عوام کے خیالات میں کوئی فرق ہے یا نہیں؟

یہ سوالات اس لیے اہم ہیں کہ بہت سے اہل غرض حضرات جب کسی کو زک دینا چاہتے ہیں تو رائے عامّہ کے ڈنڈے سے کام لیتے ہیں ان کا حال ڈکنس کے اس کردار کا سا ہے جو خود تو ہر بات کے لیے آمادگی ظاہر کرتا تھا مگر شریک کا نام لے کر مایوس کر دیتا تھا۔ ہمارا فرض ہے کہ سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور کریں تاکہ رائے عامہ کا نام لے کر ہمیں کوئی گمراہ نہ کر سکے۔

ہندوستان کی نوے فیصدی آبادی دیہات میں رہتی ہے اسّی فیصدی سے زیادہ جاہل ہے یہاں ۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں ہیں ۱۲ بڑی زبانوں کے علاقے ہیں۔ چھوٹی بڑی سترہ ریاستیں ہیں۔ ہماری آزادی کو ابھی گیارہ سال بھی نہیں ہوئے ہم نے جمہوریت کے تصور کو اپنایا ہے ..... مگر یہ تصور ابھی دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا۔ ہم نے ایک غیر مذہبی حکومت قائم کی ہے مگر ہماری آبادی کا بیشتر حصہ اتنا سخت مذہبی ہے کہ اس نے رسم و رواج کو بھی مذہب کا درجہ دے دیا ہے ہم اپنے کو ایک قوم کہتے ہیں مگر قومیت کا احساس ہمارے لیے کچھ نیا نیا سا ہے۔ یہ اس نئی شیروانی کی طرح ہے جسے پہن کر ہم اکڑتے پھرتے ہیں مگر جو ابھی ہم پر سجتی نہیں انگریزی کے ذریعے سے ہم کو سیاسی وحدت کا احساس، قومیت کا تصور، عالمی معیار، انسان دوستی کے خیالات اور بہت سی نعمتیں ملی ہیں مگر انگریزی ہمارے ملک کی

بہت ہی قلیل آبادی جانتی ہے اور اب سیاسی وجوہ کی بنا پر انگریزی سے خدا واسطے کا بیر باندھا جارہا ہے کہا جاتا ہے کہ ملک کی ۴۲ فی صد آبادی ہندی بولنے والی ہے۔ اس لیے ہندی کو سرکاری زبان قرار دینا بجا ہے مگر اس ۴۲ فی صدی میں اردو بولنے والے، پنجابی بولنے والے اور مختلف بولیوں کے برتنے والے بھی شامل ہیں۔ ہماری سیاسی پارٹیاں برسے لمبے چوڑے وعدے کرتی ہیں مگر ان کا عمل کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر سیاسی پارٹی میں مخلص اور ہوش مند لوگ ہیں مگر مجموعی حیثیت سے ان کا اثر کم ہے۔ پستی کی ایک ناقابل بیان کشش ہے جو سب کو نیچے کی طرف کھینچے لیے جارہی ہے ان حالات سے بد دل ہونا غلط ہے مگر انہیں سمجھنا ضروری ہے تاکہ ان کا مقابلہ کیا جاسکے۔

کہنا یہ ہے کہ ہمارے یہاں دراصل نہ کوئی رائے ہے نہ عام خیالات کو سمجھنے کا ذریعہ۔ رائے کے پیچھے ایک ذہن ہوتا ہے اس ذہن کے تجربات ہوتے ہیں یہ تجربے مل جل کر ایک واضح میلان کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کا معروضی طور پر تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ عام رائے کے معنی یہ ہیں کہ اس رائے میں عام لوگ شریک ہوں وہ ان کی سوچی سمجھی پالیسی کو واضح کرے اس کے پیچھے ایک منطقی استدلال ہو۔ ہمارے یہاں جس طرح کوئی رائے نہیں ہے اسی طرح عام ذہن کی کارفرمائی بھی نہیں ہے چند لیڈر عوام کی رائے کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی ضروریات یا منفعت کی بنا پر اچھی ہو سکتی ہے وہ عوام کی رائے پھر بھی نہیں ہے۔ ان لیڈروں کی کمزوری یہی ہے کہ وہ صحیح معنی میں رائے عامہ کی ترجمانی نہیں کرتے آبادی کے کچھ حصے کی رائے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

ہمارا ایمان یہ ہے کہ بنیادی طور پر ہمارے ملک کے عوام روادار، امن پسند اور منصف مزاج ہیں۔ وہ جمہوریت کو نہ سمجھیں لیکن پنچوں کے فیصلے کو سمجھتے ہیں چونکہ وہ جاہل ہیں اور مذہب کے غلط تصور نے انہیں گمراہ کر رکھا ہے۔ اس لیے مذہب کے نام پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ صدیوں تک ذات پات اور مقامی تعصبات کے بندھن میں جکڑے رہے ہیں اس لیے اس سے بلند ہونا ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ اور تعلیم جو انہیں اس چکر سے نکال سکتی تھی ابھی تک عام نہیں ہوئی ہے۔ ان کی پرانی تہذیب میں رواداری اور محبت تھی جسے

آج کل کی سطحی شہری اور کاروباری تہذیب نے دبا رکھا ہے وہ جذباتی ہیں عقل سے کام کم لیتے ہیں۔ وہ کبھی برائے نام نفع کی خاطر اپنا نقصان کر لیتے ہیں۔ وہ اشخاص پر ضرورت سے زیادہ نکتہ کرتے ہیں۔ اصولوں کی منطق ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

اس لیے ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ اپنے ملک میں صحیح معنی میں رائے عامہ پیدا کریں ہمارے تمام بڑے مسئلوں کا حل اسی پر موقوف ہے چاہے کوئی سیاسی سوال ہو یا لسانی مسئلہ، اس کا قابل اطمینان فیصلہ اسی وقت ہوگا جب عوام کی رائے اثر انداز ہوگی۔ یہ ہماری حکومت کا بھی فرض ہے اور ہم میں سے ہر شہری کا بھی۔ رائے عامہ کی بیداری کے بعد نہ جمہوریت کے تازہ گلشن میں آندھیوں کا خطرہ ہوگا نہ قومیت کی تعمیر کو خوف، نہ اچھے اور منصفانہ سماج کی تشکیل میں دیر لگے گی اور نہ اردو اور دوسری قومی زبان کو پامالی کا ڈر ہوگا۔ اس مقدس کام میں ہمیں پورے جوش اور انہماک سے لگ جانا چاہیے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۸ر جون ۱۹۵۸ء)

اٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانہ کو ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یادِ خدا میں

میں سات مہینے کے بعد اپنے وطن واپس آیا۔ چھ مہینے شکاگو یونیورسٹی میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ایک مہینہ مانٹریال، لندن، مانیس (جرمنی) اور روم میں گزارا۔ امریکہ اور یورپ کے تاثرات کا ایک اچھا خاصہ نگارخانہ ساتھ لایا ہوں جس کی جھلکیاں ہماری زبان پڑھنے والوں کو برابر ملتی رہیں گی۔ میری عدم موجودگی میں میرے رفیق ڈاکٹر مسعود حسین نے نہایت خوش اسلوبی سے ہماری زبان، اور 'اردو ادب' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ انہوں نے اردو زبان کی اہمیت اور مقبولیت کو بڑے مدلل اور موثر انداز سے اپنے اداریوں میں واضح کیا۔ ہماری زبان کا وہ خاص نمبر جو ۱۵ اپریل کو شائع ہوا ہے، اس سلسلے میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ بہت سے اردو دوستوں کو ان حقائق اور اعداد و شمار کا کما حقہ علم نہیں ہے جو اردو زبان کی ہندوستان گیر حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ چونکہ اگلی فروری میں مردم شماری ہونے والی ہے اس لیے ابھی سے انجمن کی شاخوں کو خصوصاً اور اردو کے اداروں اور کارکنوں کو عموماً اپنے اپنے حلقے میں ایسا نظام قائم کر لینا ہے جو مردم شماری کے موقع پر ہر فرد واحد سے رابطہ قائم کر سکے جس شخص کی مادری زبان اردو ہے اس کا فرض ہے کہ وہ مردم شماری کے موقع پر زبان کے خانے میں اردو لکھوائے اور اس کا اطمینان کرلے کہ اندراج صحیح ہوا ہے ہماری زبان کے اس خاص نمبر کی زائد کاپیاں بھی چھپوالی گئی ہیں جو تھوڑی سی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں میں اپنی طرف سے اور انجمن کی طرف سے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ

انہوں نے انجمن کے دفتری کاموں کی بھی دیکھ بھال کی۔

مغرب کے دورے کے بعد یہ حقیقت اور بھی کھل کر سامنے آئی کہ سب سے بڑی چیز اپنا عقیدہ اور اپنا عمل ہے۔ اگر عقیدے کی روشنی اور اس عقیدے کے مطابق عمل کی گرمی موجود ہے تو باوجود بہت سی دشواریوں کے ہم اپنی زبان کی بقا اور ترقی کی مہم میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر عقیدہ کمزور ہے اور عمل ناقص تو ظاہر ہے کہ ہمیں کامیابی نہیں ہوگی۔

ہمارا معاملہ دوسری زبانوں کے بولنے والوں سے مختلف ہے .....

ہماری زبان ایک اقلیت کی زبان ہے یہ مذہبی اقلیت نہیں ہے مگر ایک مذہبی اقلیت سمجھ لی گئی ہے، اس زبان کے بولنے والوں کی کسی ریاست میں اکثریت نہیں ہے مگر کئی ریاستوں میں اس کی خاصی بڑی آبادی ہے اور ان ریاستوں کی سماجی، تہذیبی اور علمی زندگی پر اس زبان کی گہری چھاپ ہے۔ ہندی اردو سے سب سے زیادہ قریب ہے مگر ہندی کی ریاستوں میں اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے۔ ان ریاستوں میں ہماری شاخوں پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ایک طرف وہ تمام اردو دوستوں کو ان کا فرض یاد دلائیں اور دوسری طرف ان ریاستوں کی اکثریت کو اپنا ہم نوا بنائیں محض شکایت سے کام نہیں چلے گا۔ لوگوں کو بتانا ہوگا کہ اردو کے حقوق کی پامالی کس طرح بالآخر ہندوستان کی مشترک قومیت کی پامالی ہے۔ کس طرح اس سے ہماری تہذیب کی رنگا رنگی پر زد پڑتی ہے کس طرح اقلیتوں کی بے اطمینانی یا بددلی یا برہمی پورے سماج کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہے۔ کس طرح ایک پھول کو کچلنے سے پورے چمن کی بہار خطرے میں آجاتی ہے۔ ان ریاستوں میں ہمیں سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی منزل پر اردو کی تعلیم کا مناسب اور موزوں اور تسلی بخش انتظام کرنا اور کرانا ہے میں نے یورپ اور امریکہ میں دیکھا ہے کہ اقلیتیں اپنے ادارے خود چلاتی ہیں اور حکومت ان کے لیے ہر قسم کی سہولتیں دیتی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے صرف سرکاری اعلانات کافی نہیں، ہر جگہ اساتذہ کی فراہمی، کتابوں کی فراہمی اور وقت درجوں کے انتظام کا مسئلہ ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اردو کے اسکولوں میں ریاستی زبان ہندی کی تعلیم کا معیار کسی طرح عام اسکولوں کے معیار سے کم نہ ہو۔ ہمارا اردو کو بعض ریاستوں میں

سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ، لفظ سرکاری زبان کی مسند پر شرکت کی عزت حاصل کرنے کا مطالبہ نہیں ہے، نہ کسی زبان کی اہمیت کو کم کرنے کا مطالبہ ہے۔ اس مطالبہ کی سیدھی سادی توجیہ یہ ہے کہ چند اہم انتظامی امور کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے اور اس لیے دستور کے بنانے والوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی گنجائش پہلے سے رکھی تھی۔ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ چونکہ تعلیم ریاستوں کے دائرۂ اختیار میں آتی ہے اس لیے دراصل ہمارا کام ریاستوں میں ہے مگر کسی وجہ سے اگر ریاستیں اپنے فرض سے غافل رہیں تو مرکز کو ان اختیارات کو استعمال کرنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے، جو دستور کی رو سے اسے حاصل ہیں۔ مگر میں یہ بات پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سرکاری زبان کا مسئلہ ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ مقصد اردو زبان کی بقا اور ترقی ہے، اس سلسلے میں اپنوں کو عمل کے لیے آمادہ کرنا اور دوسروں کی مخالفت یا غلط فہمی کو دور کرنا، ہمارا مسلسل کام ہونا چاہیے۔

زبان کا مسئلہ شخصیت کی استواری، ذہن کی بیداری، فکر کی بالیدگی اور کردار کی پختگی کا مسئلہ ہے۔ زبان خیال کی توسیع میں مدد دیتی ہے۔ ہماری زبان میں جدید افکار و علوم کے بھرپور اظہار کی صلاحیت موجود ہے، ہمیں اس صلاحیت کو اجاگر کرنا ہے، مگر ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی مناسب اور مضبوط بنیاد کے بغیر ہم ایسا نہیں کر سکتے اعلیٰ تعلیم کے در و بام بھی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی بنیاد پر ہی تعمیر ہو سکتے ہیں۔ اردو کی نئی یونیورسٹیاں قائم کرنے کے لیے یا کچھ یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم اردو قرار دینے کے لیے بھی پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے تسلی بخش انتظام کی ضرورت ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ اردو یونیورسٹی کی بات ہی نہ کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ترجیحات (Priorities) واضح ہو جائیں۔ ہمارا یہ مطالبہ بجا ہے کہ ہماری جمہوری حکومت جمہور کے ہر طبقے کی جائز اور مناسب ضروریات پوری کرے مگر ہمارا اپنا فرض بھی کچھ کم نہیں۔ بلکہ غور سے دیکھیے تو زیادہ ہی ہے۔ اس وقت نہ مایوس ہو کر بیٹھ رہنے سے کام چلے گا، نہ محض خوش فہمیوں سے۔ حقائق سے آشنا ہو کر انکو ہموار کرنے کی ضرورت ہے ملک و قوم کے دکھ درد میں سب کے ساتھ سینہ سپر رہنے کی ضرورت ہے۔ ساتھیوں کی نیت پر شبہ کرنے کے بجائے ان کے عمل کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ فوری کاموں اور لمبے کاموں کو الگ الگ کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کی بقا اور ترقی ہم پر منحصر ہے۔ ہم خود کچھ نہ کریں گے تو دوسرے جو اپنے طور پر اپنی زندگی کے نقشے میں رنگ بھر رہے ہیں، اپنا کام چھوڑ کر، ہماری طرف سے اس نقشے میں ہمارا رنگ کیوں بھرنے لگے۔ بات سیدھی سادی ہے مگر خدا جانے کیوں ابھی تک ردو دوست اسکو سمجھ نہیں سکے ہیں۔ سمجھ گئے ہیں تو اس پر عمل نہیں کرتے حالانکہ یہی بات سب سے زیادہ اہم ہے۔

نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہمارے ملک میں ایک مرض بہت عام ہو رہا ہے۔ کچھ افکار و اقدار صرف ماننے کے لیے ہیں۔ ان پر عمل کی ضرورت نہیں۔ عمل کی دنیا کے آداب دوسرے ہیں۔ اچھے سے اچھے افکار کی پرستش کرو، مگر روزمرہ زندگی میں ان کا خون ہوتے دیکھو، مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جاؤ کہ یہ تو ہونا ہی ہے۔ عملی دنیا میں دوسرا ہی قانون چلتا ہے، اس دورنگی اور دوعملی کی وجہ سے پوری ذہنی دنیا مسموم اور مریض ہو رہی ہے۔ ہم سیکولرزم کا نام لیتے ہیں اور مذہبی جنون کو روک نہیں سکتے۔ ہم جمہوریت کا کلمہ پڑھتے ہیں مگر جمہوریت کی روح پر ظلم کرتے رہتے ہیں۔ ہم سوشلزم کو نصب العین مان کر خوش ہیں اور سرمایہ داری یا اجارہ داری کے فروغ کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ہم اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے دعوے دار ہیں، مگر اقلیتوں کے جائز مطالبات پر کان نہیں دھرتے۔ ہم سب زبانوں کو برابر سمجھتے ہیں، مگر لسانی سامراج کو ہوا دے رہے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ قانون سب کو برابر کا حق دیتا ہے، مگر ملازمت دیتے وقت صلاحیت، قابلیت، اہلیت کو بھول جاتے ہیں اپنے صوبے، اپنی برادری، اپنے مذہب، اپنی زبان کی پاسداری کرنے لگتے ہیں۔ تعلیم گاہوں میں انسانیت، تہذیب، مساوات کا درس دیا جاتا ہے۔ خود استاد جو عملی زندگی کی سختیوں سے دبے ہوئے ہیں، ان پر عقیدہ نہیں رکھتے تو وہ طلبا کے دلوں میں ان عقائد کی گرمی کیسے منتقل کر سکتے ہیں۔ انتخاب میں امیدوار کیسا ہی ہو ووٹ تو برادری یا پارٹی کو جاتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ یہ کہتے ہیں کہ "چاہے امیدوار آسمان سے اترا ہو، ووٹ تو دوست کے لیے ہے"، اس دورنگی کا اثر سادی دنیا پر پڑتا ہے۔ پوری قوم میں

بے یقینی، احساسِ شکست، مایوسی، بے دلی عام ہونے لگتی ہے۔ اس کیفیت کے ساتھ قوم کی ترقی کی منزل کیسے طے ہوگی۔ ضرورت ہے کچھ جیالے اپنے اصولوں پر ڈٹ جائیں۔ جو کہتے ہیں وہ کریں۔ جو کر سکتے ہیں وہی کہیں۔ آسمان کی باتیں چھوڑیں۔ زمین پر سیدھے سبھاؤ چلنا سیکھیں۔ سیاسی معاملات میں مذہبی رشتے، ذات برادری، صوبے سے وفاداری کو دخل نہ دیں۔ قوم کے ساتھ اس طرح نہ لپٹیں جس طرح اکاس بیل ہرے بھرے درختوں سے لپٹ جاتی ہے اور ان کی نشوونما ختم کر دیتی ہے۔ اپنے دائرے میں اپنا کام ایمان داری سے انجام دیں۔ قوم کے مرثیے کے پردے میں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نہ چھپائیں۔ اصول کو اپنائیں تو یہ سمجھ کر کہ یہ دودھاری تلوار ہے اور اس سے دوسروں کے علاوہ کبھی کبھار خود بھی زخمی ہونا پڑتا ہے۔ ایسے سچے اور کھرے آدمیوں کی ملک و قوم کو اشد ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہوا کا رخ بدل سکتے ہیں، شروع شروع میں لوگ ان کا مذاق اڑائیں گے انہیں طرح طرح سے نظر انداز کرنے کی کوشش کریں گے، ان پر غلط الزامات لگا کر انہیں بدنام بھی کریں گے مگر رفتہ رفتہ ان کی عزت کرنے لگیں گے اور پھر ان کے ساتھ ہولیں گے۔ زبان کی خدمت ہو یا تہذیب کی، تعلیم کا دائرہ ہو یا رفاہ عام کا، ملازمت ہو یا تجارت، ایسے لوگ اپنے دائرے میں اصول پرستی کا بیج بو کر ریگستان میں نخلستان کا سماں پیدا کر سکتے ہیں۔ ہاں انہیں صرف ایک چیز سے بچنا ہوگا۔ یہ اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے، دوسرے کے اصول کو حرف غلط نہ سمجھیں، تنگ نظری کا شکار نہ ہوں بلکہ ہر اصول کو زندگی میں برتے جانے اور کھرے کھوٹے کے الگ ہو جانے کے روادار ہوں۔ تنگ نظری، مذہب ہو یا سیاست، تہذیب ہو یا سائنس، سب میں بری ہے۔ اپنے پر اعتماد سے فراخ دلی آتی ہے اور فراخ دلی سے خیالات کے پرامن تصادم اور افکار کے خاموش ٹکراؤ کا موقع ملتا ہے۔ پھر خیالات اور عمل میں تطبیق کی راہیں کھلتی ہیں۔ کاش ہم اس مشکل مگر صحیح راستے پر گامزن ہو سکیں۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ یکم جولائی ۶۲ء)

جوہر طبیعتوں کے دکھانے کا وقت ہے
شیرو یہی تو جان لڑانے کا وقت ہے

آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا یعنی پاکستان کی فوجی حکومت نے بنگلہ دیش کے حریت پسندوں کی روز افزوں کامیابی اور ہندوستان کی بنگلہ دیش کی حمایت سے برہم ہو کر، ہندوستان کے کئی شہروں پر بمباری کی اور اس کے فوراً بعد ہی باقاعدہ ہماری مغربی سرحدی مقامات پر فوجی اقدامات شروع کر دیے۔ نتیجے کے طور پر ہندوستان کو بھی جواب دینا پڑا اور مغربی اور مشرقی دونوں محاذوں پر فوجی کارروائی کرنی پڑی۔

ہندوستان امن پسند ملک ہے۔ یہ جنگ نہیں چاہتا مگر امن پسندی کے یہ معنی نہیں کہ وہ جنگی کارروائی کے بعد بھی خاموش رہے۔ پاکستان میں اس وقت فوج کی حکومت ہے اس حکومت کو وہاں کے عوام نے منتخب نہیں کیا یہ فوجی حکومت پاکستان کے باشندوں کی کسی طرح نمائندہ نہیں ہے۔ اس نے بنگلہ دیش میں بہتے شہریوں پر جو مظالم کیے ہیں ان کی مثال تاریخ میں کم ملے گی وہاں دسمبر ۱۹۷۰ء میں جو انتخابات ہوئے تھے اور جن کو فوجی حکومت نے بھی آزاد تسلیم کیا تھا ان میں عوامی پارٹی نہ صرف اپنے علاقے میں قریب قریب تمام نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی تھی بلکہ پورے پاکستان کی اسمبلی میں بھی اسے اکثریت حاصل تھی بجائے اس کے کہ اس پارٹی کو حکومت سپرد کی جاتی اور عوامی پارٹی کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن کو وزیر اعظم بنایا جاتا اس پارٹی کو غدار قرار دیا گیا اور بنگلہ دیش کے اس محبوب لیڈر کو گرفتار کر لیا گیا اس پر بس نہیں کیا گیا بلکہ وہاں کے دانشوروں، استادوں، طالب علموں اور لاکھوں شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ قدرتی طور پر اس آشوب سے بچنے کے لیے لاکھوں کی تعداد میں لوگ

ہندوستان کی سرحد میں داخل ہونے لگے اور انسانیت اور تہذیب کے نام پر ہمیں ان کو پناہ دینی پڑی۔ یہ تعداد برابر بڑھتی رہی یہاں تک کہ ایک کروڑ تک پہنچ گئی اور ہندوستان کی اقتصادی حالت اور ترقی کی ساری اسکیموں پر پناہ گزینوں کی دیکھ بھال کی وجہ سے بہت سخت اثر پڑا اس لیے ہندوستان نے آٹھ مہینے تک برابر اس کی کوشش کی کہ کسی طرح پاکستان کی فوجی حکومت بنگال کے عوام کے حقیقی جذبات کی پاسداری کرے اور وہاں کے منتخب نمائندوں کی مدد سے ایسے حالات پیدا کرے کہ یہ پناہ گزیں عزت اور سلامتی کے ساتھ اپنے وطن واپس جاسکیں۔ ہماری وزیر اعظم نے مغربی ملکوں کو صحیح حالات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک طویل دورہ بھی کیا، مگر وہاں کے عوام کی تائید اور ہمدردی کے باوجود مغربی حکومتوں نے اس معاملے میں زبانی ہمدردی کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ اِدھر بنگلہ دیش کے حریت پسندوں نے اپنے وطن کو فوجی حکمرانوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے اپنی جدوجہد تیز کردی اور انہیں اس میں کامیابی ہونے لگی اس صورت حال میں مغربی پاکستان کی فوجی حکومت نے ہندوستان کے خلاف فوجی کاروائی شروع کردی ہے، اور مجبوراً ہندوستان کو مشرق اور مغرب دونوں طرف جوابی کاروائی کرنی پڑی ہے اس وقت ہندوستان کے چھپن کروڑ عوام کو متحد ہوکر پاکستان کی فوجی کاروائی کا جواب دینا ہے اور ہندوستان کی سالمیت کی ہر طرح حفاظت کرنی ہے۔

اردو دوستوں سے ہماری اپیل یہ ہے کہ وہ اس نازک موقع پر وطن کی حفاظت میں تن من دھن سے لگ جائیں، ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کو جو قوم کا ضمیر ہوتے ہیں خاص طور پر اس وقت عوام کو ان کا فرض یاد دلانا ہے آج ہندوستان کے سبھی باشندے ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی ایک ہیں ان کا رہ نما ایک ہے۔ آج ہم سب کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے وطن کی حفاظت اور اس کی فتح کے لیے ہر ممکن کوشش۔ ہمارے چھوٹے موٹے آپس کے اختلافات اس وقت تک کے لیے ملتوی ہیں جب تک ہم اس بحران سے نہ گزر جائیں اردو دوستوں کو دوسروں کے دوش بدوش اپنا قومی فریضہ ادا کرنا ہے۔

سادگی سے کیوں چڑتے ہو؟

جب سے وزیر اطلاعات ڈاکٹر گوپال ریڈی نے ریڈیو کی خبروں کی زبان کو آسان بنانے کی کوشش کی ہے، ہندی دنیا میں ایک عجیب عالم ہے جسے دیکھو اس کے خلاف بیان دے رہا ہے، تقریریں کر رہا ہے اور احتجاج کے لیے لوگوں کو جمع کرتا پھرتا ہے۔ ہمیں اس طرزِ عمل سے سبق لینا چاہیے اور اس کی تہ میں جو ذہنیت کام کر رہی ہے اسے سمجھنا چاہیے۔ یہ ہندی یا اردو یا مراٹھی یا گجراتی کا سوال نہیں، زبان، تہذیب اور علم و انسانیت کا سوال ہے ایسے سوالات پر غلط طریقے سے سوچنا یا جذبات کی رو میں بہہ جانا یا لوگوں کے کہنے یا سننے پر مشتعل ہو جانا، قومی اور جمہوری نقطۂ نظر سے بہت نقصان دہ ہے۔ ایک مرض دوسرے مرض کے لیے جگہ بناتا ہے اور بالآخر پورا جسم امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلے اردو والوں کے مرض کو لیجیے۔ اردو والوں کے سامنے آسانی کی بات، جب آتی ہے تو بہت سے لوگ سنتے ہیں اور عمل بھی کرتے ہیں مگر اب بھی کچھ لوگ یہ کہنے سے نہیں چوکتے کہ اردو کو سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہندی یا یا جا رہا ہے۔ یہ لوگ زبان کے ارتقا اور اس کی ساخت کے اصولوں سے واقف نہیں۔ زبان عوام بناتے ہیں۔ ادیب اور شاعر، عالم اور دانشور اسے سنوارتے اور نکھارتے، اسے خوبصورت اور سڈول بناتے ہیں دھرتی کی گود میں کچا لوہا پیدا ہوتا ہے اسے صاف کر کے فولاد بنایا جاتا ہے۔ مگر فولاد آتا کہاں سے ہے اسے بھولنا نہیں چاہیے۔ اردو زبان، آسان، عام فہم، چلن کی ساتھی رہے گی تو ترقی کرے گی۔ کتابی، مصنوعی، مشکل اور عالمانہ ہو جائے گی تو شاید کلاسیکل زبان کی سی

عظمت پیدا کرلے، مگر اس میں زندگی نہ ہوگی۔

اردو والے جس منزل سے گزر چکے ہیں، ابھی ہندی والے اسے طے نہیں کر سکے۔ وہ ابھی تک یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ زبان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مشکل ہو۔ سنسکرت سے قربت کو وہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ سمجھ میں آنے کو نہیں۔ آخر بولنے اور لکھنے کا مقصد کیا ہے۔ یہی نا کہ اپنی بات دوسروں تک پہنچائی جائے۔ اب اگر ابلاغ یا ترسیل یا بات کے دوسرے تک پہنچنے میں دشواریاں ہیں تو اصل مقصد کیسے پورا ہوگا۔ کچھ لوگ مقصد کو نہیں دیکھتے۔ وہ صرف شان علمیت، قابلیت بگھارنے کی بات کرتے ہیں۔ یا اپنے آپ کو الگ ثابت کرنے کے لیے عام لفظ کو کچھ بدل کر کچھ توڑ کر استعمال کرتے ہیں اور اپنے خیال میں زبان کو اس کی اصلیت سے قریب کرتے ہیں۔ تمام ماہرین لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ لکھنے پڑھنے کی زبان اپنی اصطلاحات کے باوجود بول چال کی زبان سے قریب ہونی چاہیے۔ ہمارے یہاں الٹی گنگا بہائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دیہات کے لوگ جو ملک کی اکثریت کی نمائندگی کرتے ہیں، شہروں کی شائستہ زبان کو کم سمجھتے ہیں مگر دیہات سے شہر کی طرف جھکاؤ تو ہماری زندگی کی ایک بنیادی حقیقت ہے۔ اس جھکاؤ میں شہر کی زبان بھی دیہات سے متاثر ہوگی مگر پھر بھی دیہاتیوں کا شہر کی زبان کو اختیار کرنا ایک قدرتی عمل ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہریوں کی عام زبان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان ہے جو عرصے سے چلی آ رہی ہے اس کے پیچھے چلن کی طاقت ہے اس میں ہزاروں الفاظ فارسی، عربی کے ہیں مگر اب وہ فارسی عربی کے لفظ نہیں رہے اب یہ ہماری زبان کے لفظ ہو گئے ہیں، انہیں نکال کر ان کی جگہ پر سنسکرت کے تت سم الفاظ رکھنا بہت بڑی غلطی ہے، یہ تاریخ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہے، یہ دریا کے دھارے کو واپس لوٹانے کے مترادف ہے۔ ہندی والے آج اس دور سے گزر رہے ہیں جو لکھنؤ کے اردو والوں پر گزرا تھا۔ جب وہ دہلی کے دبستان سے ممتاز ہونے کے لیے چلن کو نظر انداز کر رہے تھے اور اپنے آپ کو آزاد خود مختار اور خود کفیل ثابت کرنے کے لیے دہلی کے روزمرہ سے انحراف کر رہے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شہری زندگی کے تقاضوں کو یعنی بولیوں کے ایک معیار حاصل کرنے کی ضرورتوں

کو نظر انداز کرنا اپنا نقصان کرنا ہے۔ جو لوگ بول چال یا تحریر میں انگریزی کے ایسے الفاظ سے بھی بدکتے ہیں جو ہماری زبان کا جز بن گئے ہیں وہ بھی اس نفسیاتی غلطی میں مبتلا ہیں۔ دراصل جب ذہن محدود ہوتا ہے تو اپنی بات رکھنے کیلئے اپنے گروہ کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے اپنے خاص اقتصادی مفاد کو رکھنے کیلئے ایک طلسم کھڑا کر لیا جاتا ہے اسکے گرد جذباتیت کا جو ہالہ ہوتا ہے وہ دور سے نور کا ایک حلقہ معلوم ہوتا ہے مگر دراصل ایک فریب۔ شری بال کرشن راؤ نے سنڈے اسٹینڈرڈ میں ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں کہ سادہ ہندی ہمارے نزدیک ملاوٹ والی گھٹیا اور بگڑی ہوئی ہندی ہے اس قول پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ کیا قیامت ہے کہ پڑھے لکھے سنجیدہ اور باشعور لوگ بھی ایک نفسیاتی مرض کا شکار ہو گئے ہیں۔ زبان کا ایک بت بنا رکھا ہے اس کی پرستش کرتے ہیں اور کوئی ان سے یہ کہے کہ بھائی تم جو زبان لکھتے ہو وہ بول چال کی زبان سے قریب ہونی چاہیے تو خفا ہوتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ملک کدھر جا رہا ہے۔ دنیا کی رفتار کیا ہے۔ جدید زندگی کے تقاضے کیا ہیں۔ صنعتی دور میں کلاسیکل زبان کا احترام ضروری ہے مگر کلاسیکل زبان کے احترام میں جدید ہندوستانی زبانوں کے مزاج اور ان کے فطری ارتقا کو نظر انداز کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ آج اتر پردیش میں یہ ستم ہو رہا ہے کہ سرکاری قانون ایسی زبان میں ہوتے ہیں جو لوگ سمجھ نہیں پاتے۔ فارم ایسی ہندی میں ہوتے ہیں کہ اس کے معنی پوچھنے پڑتے ہیں۔ درسی کتابیں جس زبان میں لکھی جاتی ہیں اس کے پڑھانے والے اسی زبان میں مطلب بتائیں تو طلبہ کا بہت بڑا حصہ سمجھ نہ پائے۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ہندی والوں کو کچھ لوگ اپنی اجارہ داری رکھنے کے لیے بہکا دیتے ہیں اور وہ یہ باور کرنے لگتے ہیں کہ یہ سب اردو کو واپس لانے کے لیے کیا کیا جا رہا ہے۔ اردو کا نام آیا اور کچھ لوگوں نے اپنے ذہن کی کھڑکی کھٹ سے بند کر دی ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

آسان ہندی کی تحریک، زبان کی بناوٹ کے اصولوں کی بنا پر ہے۔ یہ تہذیب کا ایک صالح احساس رکھتی ہے۔ یہ سماج کی ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔ اصطلاحات کا سوال نہیں وہ ضرورت کے مطابق وضع ہوں گی ظاہر ہے کہ زیادہ تعداد سنسکرت کے الفاظ سے لی جائیگی مگر کچھ ادل بدل کر کچھ اردو کی اصطلاحیں بھی کام آئیں گی کچھ انگریزی کی بھی۔ معیار یہ رہے گا کہ کانوں کو کیسی معلوم ہوتی ہیں اور اصل مقصد کس حد تک ادا کرتی ہیں۔ عام اظہار کی زبان سادہ کرنا پڑے گی نہ کیجائے تو ملک کی ترقی کو خطرہ ہے۔ اس میں دیر کیگئی تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ اور آج کی دنیا میں پیچھڑے ہوؤں کو کوئی نہیں پوچھتا! اس نکتے کو سمجھنے والے کم نہیں ہیں، مگر وہ ہنگامے سے یا مخالفت سے ڈرتے ہیں! اسلئے خاموش رہتے ہیں آج کے حالات میں خاموشی جرم ہے۔ سادگی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے تمام سمجھ دار لوگوں کو میدان میں آنا چاہیے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۲ء)

عقیدہ اور عمل

ہر کام میں سب سے پہلے ایک مضبوط عقیدے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ عقیدہ ایک بنیاد ہے جس پر عمل کا شان دار محل تیار ہو سکتا ہے۔ بغیر عقیدے کے عمل کی جو عمارت بنائی جاتی ہے وہ ریت پر تعمیر کے مترادف ہے کبھی انسان جوش میں آکر، کسی خاص جذبے کے تحت، روایت کی وجہ سے، وضع داری کے تقاضے پر دوسروں کی دیکھا دیکھی بہت کچھ کر بیٹھتا ہے مگر پھر ذراسی مخالفت، ذراسی رکاوٹ، ذراسی دقت سے تنکے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ جوش میں ابھرنے اور ذراسی مخالفت کے بعد پچک جانے کی وجہ سے اسے دنیا سے ایک شکایت ہو جاتی ہے۔ وہ صاف صاف دنیا کو برا بھلا نہیں کہہ سکتا تو اپنوں کی خبر لیتا ہے۔ اپنے بھی برداشت نہیں کر سکتے تو اپنی ذات پر ہاتھ صاف کرتا ہے یعنی ہر چیز سے بیزار ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو حق صداقت کی وہ شمع سمجھنے لگتا ہے جسے زمانے کی تند ہواؤں اور اپنوں اور بیگانوں کی بے رحمی اور چیرہ دستی نے بجھا دیا ہو۔

لیکن عقیدہ ایسے حوادث سے محفوظ رکھتا ہے عقیدہ تلوار بھی ہے اور سپر بھی، وہ غذا بھی دیتا ہے اور خون بھی دوڑاتا ہے۔ عقیدہ عمل کے لیے طاقت فراہم کرتا رہتا ہے۔ راہ کے کانٹے نکالنا ہے یا تو مخالفتوں سے بچنے کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ مخالفتوں پر قابو پانا سکھاتا ہے۔ عقیدے کی پختگی صحت مند نگاہ پیدا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کی بے پروائی کو بے حسی نہیں سمجھتی۔ وہ حالات پر نظر رکھتی ہے مگر حالات کی غلام نہیں ہوتی۔ وہ وقت کے دریا میں تنکے کی طرح بہنے سے روکتی ہے اور تیز سے تیز دھارے کو رفتہ رفتہ اپنی مرضی کے مطابق

موڑنے یا اس کی شدت کو کم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔

مثلاً ہمارا عقیدہ اپنے وطن میں مضبوط ہے تو ہم ذرا سی غفلت یا کوتاہی پر واویلا نہیں مچاتے سراسیمہ نہیں ہوتے، قربانی کے لیے بکرے نہیں تلاش کرتے، مگر غلطی کو سمجھ کر اپنی اصلاح کر لیتے ہیں اور آگے بڑھتے ہیں۔ اگر وطن اور قوم پر عقیدہ مضبوط ہے تو اس قوم کے کئی فرد یا کچھ افراد کسی وجہ سے قوم کی اکثریت سے بدظن نہیں ہوتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یا تو ہماری بات واضح طور پر کہی نہیں گئی یا سمجھ کے راستے میں کچھ دشواریاں حائل ہیں یا ہماری بات میں کچھ کمزوری رہ گئی ہے جسے دور کرنا ہے۔ ان باتوں پر غور کرنا چاہیے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ ان سے ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ جب ہندوستان کا مستقبل روشن ہے تو ہر قومی زبان کا بھی روشن ہے اور چونکہ اردو بھی ایک قومی زبان ہے اس لیے اسکا مستقبل کیسے تاریک ہو سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ کیا اردو زبان کا ہمارا تصور انیسویں صدی کی زبان کا ہے یا بیسویں صدی کی زبان کا۔ انیسویں صدی کی زبان سے بیسویں صدی فیض حاصل کر رہی ہے مگر اسمیں اضافہ بھی کر رہی ہے گو اس اضافے کو کچھ لوگ کتنا ہی برا سمجھیں۔ بیسویں صدی ہر زبان کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھے گی۔ وہ اس کے لیے انیسوی صدی یا اٹھارویں صدی کا نقطۂ نظر کہاں سے لائے۔ ہندوستان بھی اردو یا ہندی یا گجراتی یا مراٹھی اسی روپ کو گلے سے لگائیگا جو اس کی آج کی زندگی، اور اسکی ضروریات کا ساتھ دے سکتی ہے۔ ہر زبان میں اس کی صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے مگر اس پوشیدہ صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لیے مناسب تدابیر اختیار کرنی ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی اردو کے لیے بیسویں صدی کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ دراصل ہر زبان اپنے بولنے والوں کے عقیدے کو پختہ رکھنے اور ان کی ضروریات کے لیے ذہنی، نفسیاتی، روحانی، جمالیاتی غذا مہیا کرتے رہنے کی صلاحیت کی وجہ سے اہم ہوتی ہے۔ اردو بھی اسی وجہ سے اہم ہے۔ یہ اردو بولنے والوں کے نشوونما کا واحد راستہ ہے اس میں مدد دوسرے راستوں، دوسری زبانوں سے مل سکتی ہے۔ مگر کوئی اور راستہ اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اردو دوستوں کو نہ صرف اپنا کام خود کرنا ہے بلکہ اپنے کام کو قومی یکجہتی اور وطن کی ترقی کے لیے ضروری بھی ثابت کرنا ہے اور جو لوگ ناسمجھی یا ناواقفیت

کی وجہ سے اس بات کو نہیں مانتے، انہیں تنگ نظر یا متعصب کہنے کے بجائے ان کو اپنی بات صاف، واضح، مدلل اور مضبوط دلائل کی مدد سے سمجھانی پڑے گی۔ یہ بات مشکل ہے مگر ہمیں کرنا ہی ہے جو لوگ اس راستے پر چل رہے ہیں ان کو برا کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ ان کی کوتاہیاں تو ضرور بتانا چاہئیں، مگر ان کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہیے۔ اردو دوستوں کو اپنی زبان کی بنیادی اہمیت پر عقیدہ رکھتے ہوئے، حالات کو اپنے لیے سازگار بنانا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے اس کی اہمیت ثابت کریں اور آج کی زندگی میں قدم قدم پر اس کی ضرورت منوائیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اردو یہ کام کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔ اس ایمان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شریک رکھنے کی جدوجہد جاری رہے گی۔ گو کچھ لوگ اسے خاموشی یا بے عملی سمجھیں۔ عمل کے راستے ہنگامے اور نمائش سے جدا نہیں۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۱۵ر نومبر ۶۲ء)

عصری میلانات اور وقتی کارنامے

کچھ ادیبوں کے نزدیک ادب وہی ہے جس پر وقت کی کچھ گرد جم چکی ہو اور ادیب وہی مطالعے کا مستحق ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہو۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جب تک واقعہ تاریخ نہ بن جائے اس پر توجہ ہی نہ کی جائے۔ ادب میں عصری میلانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خیالات کے نئے موڑ، واقعات کی نئی کروٹیں، سماج کے دل کی نئی دھڑکنیں تہذیب کے نئے نئے رنگ، ادب پر مختلف صورتوں میں اور کئی سمتوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادب ماضی کی وہ برف نہیں ہے جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ وہ دریا ہے جس میں پہاڑوں کی پگھلی ہوئی برف کے ساتھ وادیوں کے پھولوں، مٹی اور خس و خاشاک کی ساری متاع ملی ہوئی ہے۔ ادب روح عصر رکھتا ہے وہ وقت کے تقاضوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جب ہم اس سر بفلک پہاڑوں کو دیکھتے ہیں جو اپنے جلال و جمال کی وجہ سے ہم میں ایک پراسرار کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ہمیں ان چھوٹے چھوٹے پہاڑی نالوں، سرسبز وادیوں اور گرتے ہوئے آبشاروں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ان پہاڑوں کی متاع سے میدانوں کی جھولی بھر دیتے ہیں۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم موجودہ دور کے ہر واقعے کو تاریخی اہمیت کا حامل اور اس کی ہر موج کو ایک دریا سمجھ لیں۔ ہر کتاب کو حرف آخر، ہر ادیب کے کارنامے کو عظیم اور ہر شخص کو عہد آفریں کہنے سے یہ الفاظ اپنا مفہوم کھو بیٹھتے ہیں۔ اخباروں کے اداریوں میں روز ہم قیامت صغریٰ کی خبر اور اس پر تبصرے پڑھتے ہیں۔ ہر جھگڑا وقت

کی ساری پہنائی کا خلاصہ نظر آتا ہے۔ ہر سیاست داں، ہمیں دیوتا معلوم ہوتا ہے۔ ہر کانفرنس چوٹی کی کانفرنس اور تمام مسائل کا حل معلوم ہوتی ہے۔ ادب میں سیاست کا شعور ضروری ہے مگر ادب کو اس وقتی اور ہنگامی سیاست سے کچھ بلند ہونا چاہیے۔ ادب کو ہنگامی سیاست کے مبالغہ آمیز پیرائے سے ہٹ کر چیزوں اور کاموں میں تناسب، توازن مناسب آہنگ ڈھونڈھنا چاہیے اس لیے اردو میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ اپنے دور کی شخصیتوں کو پہچانتے ہوئے، ان کے کارناموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم صرف شخصیتوں کے تعارف اور کارناموں کی عاجلانہ تنقید میں نہ الجھ جائیں۔ ہم ابھرتی ہوئی شخصیتوں پر نظر رکھیں، ہم ہر نئی تصنیف کا مطالعہ کریں، مگر ان شخصیتوں اور ان کے کارناموں کو ذرا ہٹ کر، ذرا بلند ہو کر، ذرا غیر جانب داری سے بھی دیکھیں۔ آج کل شخصیتوں سے جو شغف بڑھ رہا ہے، خطوط کا جو انبار ہے، تعارف کا جو سلسلہ ہے وہ دلچسپ ہو تو ہو، زیادہ مفید نہیں ہے۔ اول تو یہ چیزیں معروضی کم ہوتی ہیں۔ ان میں یک رخا پن زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے ان کی وجہ سے ہر معمولی شے غیر معمولی، ہر شخص شخصیت، ہر سایہ پراسرار بن جاتا ہے۔ تیسرے ان کی دلچسپی کی وجہ سے ہماری توجہ، نظم کے امکانات، غزل کے میلانات، تاریخ کے رجحانات، فلسفے کے اشارات، سماج کی ترقی کے نشانات، سائنس کے انکشافات پر جم نہیں پاتی۔ اپنے دور کی کرنوں کو بھلائے رکھنا غلطی ہے۔ مگر ان کو سورج سمجھ بیٹھنا اس سے بڑی غلطی ہے۔ اور سورج سمجھ بیٹھنے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ فطری بات ہے کہ ہم اپنے دور سے دلچسپی زیادہ رکھتے ہیں۔

اردو میں تعارف، مقدمے، پیش لفظ کا جو سلسلہ چلا ہے اسے بھی کم ہونا چاہیے۔ ان چیزوں کی خوبی سے انکار نہیں مگر اس سیلاب میں اب خس وخاشاک زیادہ آرہا ہے۔ ہر شخص نقادوں کے اشارات کو دیکھتا ہے، مصنف کے کارنامے کو نہیں پڑھتا۔ یہ جو ہر دوا گولی کی شکل میں ملتی ہے اور گولی میں آٹھ دس دواؤں کا ست ہوتا ہے اس کے اثر سے (Tabloid Literature) بہت بڑھ رہا ہے۔ اردو ادب میں تخلیق پر بجا زور دینا چاہیے۔ اور تخلیق کو افسانہ وافسوں کے چکر سے نکال کر اس میں علم کی

سنجیدہ گفتاری اور فطرت، کائنات اور انسان کے شعور کی گہرائی پیدا کرنا چاہیے۔ یہ کام مشکل ہے مگر کرنے کا ہے۔ ہمیں نظم، ڈرامے، افسانے، غزل کو چھوڑنا نہیں ہے اس میں تجربے، مطالعے اور علم کی وہ روح سمیٹ لینا ہے جس کے اثر سے ہمارا ادب بصیرت کا خزانہ اور تجربات کی جنت بن جائے۔ ہر سفر میں آغاز کے عرفان، گرد و پیش کے علم اور منزل کے احساس کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمیں یہ جامعیت پیدا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ریاض کرنا چاہیے۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۲۲ جون ۱۹۶۰ء)

فوری حل اور دُور رس پروگرام دونوں پر نظر ضروری ہے

آج کل ملک میں جو حالات ہیں اور دنیا کا جو رنگ ہے اس کی وجہ سے ایک ذہنی ہسٹریا پیدا ہو رہا ہے، لوگ پریشان ہیں اور ذرا سی گڑبڑ انہیں اور پریشان کر دیتی ہے۔ غلے کی پیداوار میں کمی، وقت پر بارش نہ ہونا، خشک سالی، ضرورت کی چیزیں روز افزوں گرانی، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، سیاسی حالات میں ہیجان نے عام لوگوں کو خاصا بدحواس اور سراسیمہ کر دیا ہے، جمہوریت سے جو انہیں توقعات تھیں وہ پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ انہوں نے جمہوری نظام سے فائدہ اٹھا کر اپنے جذبات کا اظہار تو کر دیا ہے اور یہ امید بھی باندھی ہے کہ جن لوگوں کو طاقت کا نشہ تھا، وہ اپنی اصلاح کریں گے، مگر جب کوئی فوری تبدیلی نظر نہیں آئی تو امید بھی بہت جلد مضمحل ہو رہی ہے ایسے میں ہمیں غور سے حالات کا جائزہ لینا چاہیے اور جذبات کے بجائے عقل سے کام لینا چاہیے، حالات کی پیچیدگی کو سمجھنا چاہیے اور ان حالات میں اپنے لیے راستہ پیدا کرنا چاہیے۔

جمہوریت کے معنی یہ ہیں کہ قانون کی حکومت ہو، دستور کتنا ہی اچھا قانون دے مگر قانون کا نفاذ ملک کی اخلاقی صلاحیت کے مطابق ہوتا ہے۔ دستور اخلاق عطا نہیں کر سکتا ہاں جمہوریت کا ایک اخلاق ہے، یہ حقوق و فرائض کے رشتے کو پہچاننے کا اور اس پر ایمانداری سے عمل کرنے کا ہے، حقوق پر اصرار اور ان کا مطالبہ ضروری ہے۔ چند حقوق کو چھوڑ کر در اصل ہم اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتے مثلاً قیمتوں کی گرانی پر، حکومت کے کارکنوں کی بے پروائی پر، رشوت کے مطالبات پر، ذاتی مفاد کی خاطر قومی ضروریات کے پامال ہونے پر

ہمارا احتجاج بہت کم ہوتا ہے، ہاں جب ہم پر ضرب پڑے تو ہم قوم پر ظلم کی دہائی دیتے ہیں۔ ہم صدیوں کی غلامی کی وجہ سے مظالم برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے حقوق پر اصرار کرنا چاہیے، ان کے حاصل کرنے کے لیے احتجاج کرنا چاہیے ان کے لیے مناسب حلقے بنا کر تحریک پیدا کرنا چاہیے مگر یہ کافی نہیں ہے۔

ہمیں اپنے فرائض پر دھیان دینا چاہیے۔ مثلاً جمہوریت میں ہم مذہب، ذات، علاقے کی زبان کی بنا پر دوسروں پر فضیلت کا مطالبہ نہیں کر سکتے، ہاں یہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کوئی بے انصافی نہیں ہونی چاہیے اور اگر کوئی بے انصافی کرتا ہے یا ہمارے مذہب یا علاقے یا زبان کی وجہ سے ہماری صلاحیت کو نظر انداز کرتا ہے تو ہمیں اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ دراصل ہم اس بات کے عادی ہو گئے ہیں کہ ہندو، ہندو کی غلطی سے چشم پوشی کرے۔ مسلمان، مسلمان کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرے۔ برہمن، برہمن کی جائز ناجائز مدد کرے۔ سیّد، سیّد کے ساتھ رعایت کرے۔ جب ہم سب ایسا کریں گے تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ جو اقلیت میں ہوں گے وہ نقصان میں رہیں گے۔ اس لیے قومی معاملات ہیں، پبلک لائف میں، روزمرہ کے نظام میں صرف صلاحیت کو دیکھنا چاہیے۔ ہاں ان طبقوں کو جو تاریخی حالات کی وجہ سے اپنی صلاحیت نہیں دکھا سکے، سب کے برابر آنے کا موقع دینا دوسری بات ہے۔

اگر عام زندگی میں اپنے طور پر ہم جمہوریت کے مطالبات کو برتنے لگیں تو ہمارے لیے یہ آسان ہوگا کہ ہم اس کے اصولوں پر حکومت سے عمل کرائیں۔ اس وقت کسی زیادتی کے خلاف ہمارا احتجاج ایک فرد یا ایک گروہ کی طرف سے نہیں ہوگا بلکہ پوری قوم کے اصولوں کی طرف سے ہوگا، اگر حکومت یا سماج کا کوئی اور طبقہ اس وقت اس احتجاج کی طرف سے غفلت برتے گا تو اسے اس کا نتیجہ بھی بھگتنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں قومی، سماجی، کاروباری، دفتری، دنیوی معاملات میں ان فرائض کو ادا کرنا چاہیے جو ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر ان حقوق کے حاصل کرنے کے لیے ہمیں نئی توانائی بھی ملے گی اور ہماری توانائی پوری قوم کی توانائی ہوگی۔

دوسرے ہمیں فوری اور دوررس پروگرام میں فرق کرنا چاہیے۔ فوری حالات کے لیے اور مستقبل کے لیے حل دونوں پر نظر رکھنا چاہیے۔ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ بیس برس سے جو غلطیاں ہو رہی ہیں وہ ایک دن میں درست نہیں ہو سکتیں اور غلطی کسی کی ہو خمیازہ سبکو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات کی پیچیدگی کو سمجھ کر جمہوریت کے تقاضوں کے مطابق قومی زندگی میں پوری شرکت کر کے سماج کا دکھ درد اپنا کر ہم اپنے مخصوص دکھوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ چرچل نے ڈنکرک کے بعد انگلستان کو خون پسینہ اور آنسوؤں کا پیغام دیا اور انگلستان نے ہمت ہارنے کے بجائے اپنی کمر کس لی۔ موجودہ حالات میں ہمیں بھی اپنے میں، اپنی قوم میں اور اپنی جمہوریت میں اعتماد اور عقیدہ پیدا کر کے اپنے حالات کے سدھار میں لگ جانا چاہیے۔

کچھ بنیادی حقائق

عام چناؤ کے بعد جب کچھ ریاستوں میں غیر کانگریسی حکومتیں بنیں تو بہت سے اردو دوستوں کو یہ امید بندھی کہ اب اردو کے ساتھ انصاف ہوگا، اور اردو دوستوں کا اتر پردیش اور بہار میں سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم کرنے کا مطالبہ منظور کر لیا جائے لیکن اب حالت یہ ہے کہ اگرچہ ان حکومتوں کے پیچھے کچھ پارٹیوں نے اردو دوستوں کے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا تھا اور ان حکومتوں کے بنتے وقت اس کا اعلان بھی ہوا تھا، مگر اب جن سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے یا اخلاقی کمزوری کی وجہ سے یہ حکومتیں ٹال مٹول کر رہی ہیں۔ ہم نے پہلے بھی کہا تھا اور پھر اسے دہرانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ایک طرف اردو دوستوں کو یہ خوش فہمی نہ ہونی چاہیے کہ جو جماعتیں کانگریس کی مخالف ہیں وہ اردو کے ساتھ انصاف ضرور ہی کریں گی، دوسری طرف یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ کانگریس ہی بالآخر اردو کا حق تسلیم کرے گی یا کانگریس ہرگز ایسا نہیں کرے گی بلکہ جو لوگ اردو کی حمایت کرتے ہیں ان کو سراہتے ہوئے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مختلف وجوہ سے جن علاقوں میں ہندی کا رواج ہے یا جہاں فرقہ واریت کا خاصا زور ہے، وہاں اکثریت کچھ تعصب اور کچھ بے نیازی کی وجہ سے اردو کو اس کا حق دینے کو تیار نہیں ہے اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے معنی قوم و ملک سے مایوس ہو جانے کے نہیں بلکہ اکثریت کو اس کا فرض یاد دلا کر، اس کے ذہن کو کشادہ کر کے، اسے حقائق سمجھا کر راہ راست پر لانے کے ہیں یہ کام دیر طلب ضرور ہے مگر ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے۔ لیکن اس سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ اپنے اپنے حلقے میں اردو دوست

ابتدائی و ثانوی منزل پر اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے کے لیے اپنے ادارے کھولیں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کے قومی اداروں میں اردو کی تعلیم کے لیے پارلیمنٹ کے ممبروں قومی کارکنوں، اسمبلی کے ممبروں، با اثر حضرات کی مدد لیں، آج کل دوسرے اسی وقت مدد کرتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ جس کا کام ہے وہ بھی کچھ کر رہا ہے اردو دوست اب بھی حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کی طرف دیکھتے ہیں۔ یہ غلط بات ہے حکومت اور سیاسی پارٹیوں کو ان کا فرض یاد دلانا چاہیئے، مگر اس انتظار میں بیٹھے نہیں رہنا چاہیئے کہ وہ سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم کر لیں تو ہمارا کام چل نکلے ہمیں سب محاذوں پر ایک ساتھ لڑنا ہے، حکومت کو اس کا فرض یاد دلانا ہے، سیاسی پارٹیوں کو جتانا ہے کہ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے اردو کا کیس علاقائی زبانوں میں، ہندی میں اور انگریزی میں دلائل کے ساتھ برابر پیش کرنا ہے، مگر اردو دوستوں کو پست ہمتی، احساس شکست، بے حسی، ابن الوقتی سے بھی نکالنا ہے اور انہیں یہ یاد دلانا ہے کہ کوئی کچھ کرے یا نہ کرے انہیں اپنے بچوں کو ہر حال میں اردو پڑھانا ہے۔ آج کل اقتصادیات کی سب سے زیادہ اہمیت ہے، اس لیے ایک طرف اردو دوستوں کو اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانا ہے تاکہ وہ آج کے مقابلے کے دور میں اپنے لیے جگہ بنا سکیں، دوسرے انہیں اس طرف مائل کرنا ہے کہ وہ اردو کے تعلیمی اداروں کو خود چلائیں اور ان کا خرچ خود برداشت کریں تیسرے انہیں اپنے کاروبار میں اردو جاننے والوں کو ترجیح دینا ہے تاکہ اردو جاننے والوں کو ملازمت بھی مل سکے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف حکومت اردو کو سرکاری زبان تسلیم کرے پھر ساری مشکلات حل ہو جائیں گی، وہ بڑے دھوکے میں ہیں۔ آخر اعلان پر عمل بھی کوئی چیز ہے اور اس بے نیاز اور بے پروا حکومت یا اکثریت سے یہ توقع کہ وہ ایمانداری سے ہر اعلان پر عمل کرے گی، خوش فہمی نہیں تو اور کیا ہے؟ عمل بھی ہمیں ہی کرانا ہوگا۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضہ یہ ہے کہ سہل نسخوں اور چھوٹے راستوں کی طرف تکنا چھوڑ دیں لمبا اور مشکل اور دور رس پروگرام اپنائیں، قومی کاموں میں کھلے دل سے شرکت کریں، علاقائی زبانوں کی حمایت کریں مگر ہر حال میں دیکھتے رہیں کہ اردو کے لیے ہم خود کون سے ٹھوس اور عملی قدم اٹھا رہے ہیں اور دوسروں کو اردو کے لیے کچھ کرنے پر کہاں تک آمادہ کر سکے ہیں۔ کام بڑا ہے اور لمبا ہے مگر کرنے کا ہے اور ہم کر بھی سکتے ہیں۔

تعمیری نقطۂ نظر اور احتجاجی نقطۂ نظر

ہم بہت دنوں سے کہتے آئے ہیں کہ اردو دوستوں کو تعمیری نقطۂ نظر پر زور دینا چاہیے، صرف احتجاجی پروگرام نہیں بنانے چاہئیں، ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ احتجاج سرے سے نہ ہو اور اپنے جائز مطالبات حکومت تک نہ پہنچائے جائیں۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ احتجاجی طریقۂ کار کی کشش اور بعض دوسرے معاملات میں اس کی کامیابی کی وجہ سے ہمیں حقائق سے روگردانی نہ کرنی چاہیے اور اولین اہمیت کے کاموں کو مقدم رکھنا چاہیے اور بعد کے کاموں کو موخر۔ اس نکتے کی تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے۔

اردو دوست بجا طور پر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اردو کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہے اور ایسے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں کہ ان کی زبان کا وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ یہ حالات کیا ہیں؟ اردو کی تعلیم ابتدائی منزل پر زیادہ تر کاغذ پر ہے عمل میں نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ضلع پریشد اور دوسرے ادارے اردو کے ابتدائی اسکول کھولنے میں پس و پیش کرتے ہیں لیکن اگر ہم خود ایسے اسکول کھولیں تو ہمیں روک نہیں سکتا۔ دینی تعلیمی بورڈ والوں نے اتر پردیش میں پچھلے چند سال میں خاصی بڑی تعداد میں اسکول کھولے ہیں اور ان میں ایک لاکھ سے اوپر بچے بھی پڑھ رہے ہیں۔ آخر انجمن کی ہر شاخ ایک ایسا اسکول کیوں نہیں چلا سکتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنے حلقے میں تعمیری کام کرنے سے جی چراتے ہیں اور صرف اخبار میں بیان دے کر یا پلیٹ فارم پر تقریر کر کے اور اکثریت اور حکومت کے مظالم گنوا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں ظاہر ہے کہ توانائی تو محدود ہی ہوتی ہے اگر وہ تقریروں میں یا بیانوں میں

یا سیاسی چالوں میں ضائع ہو جائے گی تو تعمیری کاموں کے لیے کہاں سے آئے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم صرف ایک ہی میدان جانتے ہیں اور وہ ہے سیاسی میدان، ہم اصلاحی کاموں، خدمتِ خلق کے کاموں، سماج سدھار کے کاموں، ان کے طریقہ کار سے ناواقف ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ موجودہ سیاسی جد وجہد کو ہم نے ہر مرض کا علاج تصور کر رکھا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ یہ سستی سیاست ہے، حقیقی سیاست کے پیچھے بڑا خاموش، باقاعدہ منظم اور مسلسل تعمیری کام ہوتا ہے۔ کارکن اس کی بھٹی میں تپ کر کندن بنتے ہیں۔ پھر وہ اپنی ضروریات دیکھ کر اپنا پروگرام بناتے ہیں اور پروگرام پر عمل کرنا اس کا اشتہار دینے سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔

پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ جمہوریت نے جو حقوق دستور کے ذریعہ ہمیں دیے ہیں ان کے ساتھ کچھ فرائض بھی ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم فرائض سے روگردانی کریں، اور حقوق ہمیں مل جائیں۔ یہ فرائض کیا ہیں؟ شہریت کے مطالبات کی پابندی، سماج کی ضروریات کا احساس، قومی کاموں میں شرکت، اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا جذبہ ان کے ساتھ حقوق کا مطالبہ ہو تو اس کا اثر ہوتا ہے، مگر اس سے زیادہ اثر ان مطالبات کا ہوتا ہے جو خود کام کرنے والوں کی طرف سے ہوں، کام کا اثر ہوتا ہے۔ کرنے والے کی شخصیت میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے، اس کا کردار بنتا ہے، دوسرے اس کردار سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم سرکاری زبان یا علاقائی زبان کے لیے کبھی ایک سیاسی پارٹی سے لو لگاتے ہیں، کبھی دوسری سے، ایک سے مایوس ہوتے ہیں تو دوسرے کا دامن تھامتے ہیں۔ ہمیں کسی کا دامن تھامنا نہ چاہیے۔ نہ کانگریس ہمیں کچھ دے گی نہ مخالف جماعتیں۔ یہ سب اردو کو بھی اپنی بساط کا ایک مہرہ سمجھتی ہیں ان میں سے کچھ نیک نیتی سے کچھ کرنا بھی چاہتی ہوں تو ان کے عام ممبر کرنے نہیں دیں گے۔ کیونکہ ان میں اب بھی خاصی ناواقفیت یا بے حسی یا تنگ نظری ہے۔ اس لیے سیاسی پارٹیوں کے درمیان اردو کے معاملے کو فٹ بال بنانے سے بچنا چاہیے، اپنے کام میں لگ جانا چاہیے، اسکول کھولنے چاہئیں ابتدائی اسکول بھی اور ثانوی اسکول بھی، پھر یہ بھی خیال کرنا چاہیے کہ یہ اچھے اسکول ہوں، اور ان میں علاقائی زبان یا ہندی یا انگریزی کی تعلیم کا اچھا معیار ہو۔ اس کے علاوہ بالغوں کی تعلیم کے مرکز کھولنے چاہئیں ریڈنگ روم چلانے چاہئیں، سستی اور اچھی کتابیں شائع کرنی چاہئیں۔ اردو پڑھنے والوں کی اقتصادی حالت کو مضبوط بنانے کی تدبیریں کرنی چاہئیں۔ یہ ہوگا تو ہمارے حقوق خود بخود ہم کو مل جائیں گے، یہ نہ ہوگا تو حقوق کی دوڑ میں ہم سیاسی پارٹیوں کے ہاتھ میں کھلونا بنے رہیں گے۔

یہ کیسی جمہوریت ہے؟

(۱) ہمارے دستور میں صراحت کی گئی ہے کہ اگر کسی ریاست میں ایک قابل لحاظ آبادی ریاست کی سرکاری زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان بولتی ہے تو صدر اپنے حکم سے لسانی اقلیت کی زبان کو ان کاموں کے لیے جن کا حکم میں ذکر ہوگا سرکاری زبان تسلیم کر سکتے ہیں دفعہ ۳۴۷۔

دستور کو نافذ ہوئے بیس برس ہو گئے اس عرصے میں دو بار انجمن ترقی اردو ہند نے اپنے نمائندہ وفد کے ذریعہ صدر جمہوریہ کو اس طرف توجہ دلائی کہ اتر پردیش، بہار اور دہلی میں اردو کو بھی سرکاری زبان کا درجہ ملنا چاہیے، مگر ابھی تک مرکزی حکومت نے صدر کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ وہ ایسا حکم جاری کریں، انجمن کے علاوہ دوسرے اداروں نے اور اشخاص نے صدر کو اس طرف توجہ دلائی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا ایسا کیوں ہوا؟

(۲) دستور کی دفعہ ۳۵۰ الف میں صراحت کی گئی ہے کہ ہر ریاست کی حکومت اس بات کی کوشش کرے گی کہ لسانی اقلیتوں کو ان کی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دے۔ آخر کیا بات ہے کہ جنوبی ہند کی ریاستوں کی اقلیتوں کو اس باب میں عام طور پر ریاستی حکومتوں سے شکایت نہیں ہے مگر شمالی ہند کی ان ریاستوں میں جہاں ہندی سرکاری زبان ہے ریاستی حکومت کی کوششیں ایسی حقیر اور کم مایہ ہیں کہ اقلیتوں کو سخت شکایت اور بے اطمینانی ہے خصوصاً اتر پردیش کی حکومت میں جہاں ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۶۸ لاکھ اردو بولنے والے تھے، جواب ہر حساب سے ایک کروڑ سے زیادہ ہوں گے، آج بھی ابتدائی تعلیم اردو کے ذریعہ سے

حاصل کرنے والوں کی تعداد بہار سے بھی کم ہے جہاں کی اردو بولنے والی آبادی ۱۹۶۱ء میں ۴۲ لاکھ سے زیادہ نہ تھی، یہ کون سی کوشش ہے اور اس بے پروائی بے اعتنائی اور بے حسی کو کیا کہا جائے۔

(۳) سہ لسانی فارمولے کے متعلق مرکزی وزیر تعلیم یہ بات واضح کرتا ہے کہ اس میں کسی جدید ہندوستانی زبان کو تیسری زبان کے طور پر پڑھایا جائے مگر اتر پردیش کی حکومت اس پر اصرار کرتی ہے کہ وہ ساری زبانیں پڑھائی جائیں گی جن کا ذکر دستور کے آٹھویں شیڈول میں ہے تاکہ سنسکرت کی بھی گنجائش رہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لسانی اقلیتوں کے طلبا کی مادری زبان کے لیے بھی سہ لسانی فارمولے میں گنجائش نہیں نکل سکتی ہاں جب بہت چیخ پکار ہوتی ہے تو کچھ اسکولوں میں انتظام کر دیا جاتا ہے مگر نہ کتاب کا تعین ہوتا ہے نہ وقت پر استاد ملتا ہے اس لیے جو سہولت کاغذ پر دی جاتی ہے وہ عملاً نہیں ملتی، اس کو کیا کہیے۔

(۴) ۱۹۴۸ء میں تعلیم کے وزیروں کی کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ ثانوی تعلیم مادری زبان میں دینے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

۱۹۶۱ء میں بڑے وزیروں کی کانفرنس اس کی تائید کرتی ہے مگر لسانی اقلیتوں کے کمشنر کے دریافت کرنے پر اتر پردیش کی حکومت کہتی ہے کہ وہ ثانوی تعلیم صرف ہندی میں دینے کی قائل ہے، یہ کیا اسرار ہے؟۔

(۵) اتر پردیش کی حکومت ابتدائی تعلیم لسانی اقلیت کی زبان میں دینے کے اصول کو تسلیم کرتی ہے اور کہیں کہیں اس کا انتظام بھی کر دیتی ہے مگر استادوں کی تربیت، کے لیے کوئی تربیتی اسکول نہیں کھولتی، آخر اردو کے پرانے استاد کب تک کام آئیں گے، اور اگر نئے استادوں کی تربیت نہ ہوگی تو نئے اسکول میں تعلیم کون دے گا۔ کیا ہندی کے استاد اردو بھی پڑھا دیں گے، استادوں کی تربیت کے مناسب انتظام کے بغیر لسانی اقلیتوں کی زبان میں ابتدائی تعلیم کی کوشش کس طرح کامیاب ہو سکتی ہے کاش کوئی ہمیں سمجھائے۔

(۶) اتر پردیش کے ہائی اسکول بورڈ کے قواعد میں یہ صاف لکھا گیا ہے کہ اگر کوئی طالب علم ہندی کے علاوہ انگریزی میں یا اپنی مادری زبان میں ہائی اسکول کے امتحان کے پرچوں کے جوابات لکھنا چاہتا ہے تو انسپکٹر آف اسکولس اسے اس کی اجازت دے سکتا ہے۔ کیا وجہ

ہے کہ انگریزی میں جواب لکھنے کی تو اجازت آسانی سے مل جاتی ہے مگر اردو میں جواب لکھنے کی اجازت حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ آخر اس کی اجازت کے کیا معنی جس پر عمل کرانے میں لو ہے لگ جائیں۔

(۷) جب چناؤ کا وقت آتا ہے تو ہر پارٹی اردو میں ہزاروں لاکھوں پوسٹر اور اشتہارات تقسیم کرتی ہے مگر ووٹروں کی فہرست اردو میں چھپوانے کا سوال آئے تو حکومت بغلیں جھانکنے لگتی ہے۔ اتر پردیش میں ہندی کے بعد اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے مگر یہاں کے شہروں میں بہت کم سڑکوں کے نام اردو میں ملیں گے چناؤ کے موقع پر اردو کیوں یاد آتی ہے اور چناؤ کے بعد کیوں بھلا دی جاتی ہے، کوئی ہمیں بتائے۔

(۸) اس کی کیا وجہ ہے کہ نہ صرف جنوبی ہند میں بلکہ مغربی بنگال میں، مہاراشٹر میں، گجرات میں اردو کے خلاف ریاستی حکومت کا رویہ بے حسی کا نہیں ہے۔ دفتری نظام کی خرابیوں کی وجہ سے شکایات ضرور ہوتی ہیں، مگر ہندی کی ریاستوں میں یعنی اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان اور ہریانہ میں اردو دوستوں کو بہت شکایات ہیں بہت دنوں سے ہیں اور ان شکایات کو دور کرنے کے لیے کوئی مثبت اور قرار واقعی کوشش نہیں ہوئی ہے ہاں طفل تسلیاں برابر دی جاتی ہیں، کیا دوسری ریاستوں کا جمہوریت کا تصور دوسرا ہے۔ اور ہندی ریاستوں کا دوسرا؟ کیا کوئی ماہر فن اس تضاد پر روشنی ڈال سکتا ہے کہ ہماچل پردیش میں اردو کو بھی سرکاری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے اور پنجاب کے ایک وزیر پنجاب میں بھی اسے سرکاری طور پر تسلیم کرانے کے لیے کابینہ میں تجویز پیش کر رہے ہیں۔ مگر جہاں سب سے پہلے یہ ہونا چاہیے تھا یعنی اتر پردیش، بہار اور دہلی میں وہاں مسلسل خاموشی ہے گھر والوں کی اس بیگانگی کو کیا کہیں؟

جمہوریت کی ترازو بڑی سچی ہوتی ہے وہ قول و فعل میں یکسانیت چاہتی ہے وہ دورنگی کی قائل نہیں ہوتی سچے جمہوریت پرست وہ ہوتے ہیں جن کا عمل ان کے دعووں کے مطابق ہوتا ہے۔

یومِ جمہوریت

۲۶ جنوری کو ہماری جمہوریت اکیس سال کی ہو جائے گی۔ اکیس سال کے نوجوان کو ہمارے دستور کے مطابق ووٹ دینے کا حق ملتا ہے، وہ بالغ ہی نہیں عاقل بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہماری جمہوریت اب عنفوانِ شباب کی منزل سے نکل کر شباب کی شاہراہ پر آگئی ہے، شباب کو ان بجھے ہوئے، بددل، بیزار بوڑھوں کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے جو ہر جوش اور جذبے، ہر حرکت اور ہنگامے کو اس طرح دیکھتے ہیں گویا یہ سب چیزیں قربِ قیامت کی دلیل ہیں۔ شباب کے سوز و ساز اور درد و داغ اور اس کی آرزو اور جستجو سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرنا چاہیے، دوسرے لفظوں میں پرانی، پرسکون زندگی کی سہانی یادوں سے کام نہ چلے گا۔ آج کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی، خوب سے خوب تر کی جستجو کرتی ہوئی، صدیوں کی رکاوٹیں اور الجھنیں دور کرنے کی سعی میں لگی ہوئی زندگی کا عرفان حاصل کرنا پڑے گا۔ تب جا کر ہم موجودہ دور کے آشوب کو جھیل سکیں گے تبھی ہم یہ سمجھنے کے اہل ہوں گے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیے۔

ہندوستان کی جمہوریت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے چین کو چھوڑ کر ہندوستان، دنیا کی سب سے بڑی آبادی رکھتا ہے۔ کشمیر سے کنیا کماری تک اور کچھ سے کلکتے تک آب و ہوا، رسم و رواج، زبان، تہذیب، رہن سہن کا خاصہ فرق ہے، ہندو مذہب کے ماننے والوں کی بھاری اکثریت ہے، ..... مگر مسلمانوں کے علاوہ جن کی تعداد پانچ اور چھ کروڑ کے درمیان ہوگی، سکھوں، عیسائیوں، پارسیوں، جین اور بدھ مت کے ماننے والوں کی بھی قابلِ لحاظ آبادی ہے۔ بیس کے لگ بھگ بڑی زبانیں ہیں جنہیں

قومی زبانیں کہا جا سکتا ہے اس کے علاوہ زبانوں اور بولیوں کی تعداد بھی خاصی بڑی ہے۔ ایسے بڑے ملک میں جمہوریت کا تجربہ کوئی معمولی تجربہ نہیں ہے، انگریزوں کے زمانے سے آزاد ہندوستان کا مقابلہ کسی طرح صحیح نہیں۔ اچھی حکومت خود مختار حکومت کا بدل نہیں ہوتی اور پھر انگریزی حکومت تو اچھی حکومت کے ذیل میں بھی نہیں آتی تھی اس کا مقصد ہندوستان کی دولت سے انگریزوں کا گھر بھرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ جمہوریت کے اصولوں کو چلانا سیکولرازم کی بنیادوں کو مضبوط کرنا اور ملک کو سوشلزم کی طرف لے جانا آسان کام نہیں ہے۔ مگر باوجود دقتوں اور دشواریوں کے یہ کام ہو رہا ہے ہماری آبادی چونکہ تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وسائل اس رفتار سے نہیں بڑھ رہے ہیں اس لیے ہماری مشکلات میں اضافہ قدرتی ہے۔ مگر ایمانداری سے دیکھا جائے تو ان اکیس سالوں میں ہم آگے ضرور بڑھے ہیں گو ہماری ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے، دراصل ہمارے سیاست دانوں نے اقتدار حاصل کرنے کو زیادہ اہمیت دی ہے ملک کی خدمت کو کم، ایسا نہیں ہے کہ لوگوں نے دولت نہیں پیدا کی، مگر یہ دولت ابھی چند لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ ملک کے عوام کو اس میں حصہ بہت کم ملا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ایک طرف جمہوریت کی بنیادوں کو مقبول کریں اور پر امن طریقے سے ملک میں اور سماج میں تبدیلیاں لائیں دوسری طرف ہم آبادی کے اس تیزی سے بڑھنے کو روکیں، تیسری طرف کم سے کم آمدنی اور زیادہ آمدنی کے درمیان خلیج کو کم کریں، چوتھی طرف غذا کی پیداوار کیساتھ مصنوعات کی پیداوار کو بڑھائیں، بیرونی امداد سے بے نیاز ہوں بڑی طاقتوں کی سیاست میں گرفتار نہ ہو پائیں، صنعتی دور کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے سائنس اور ٹکنالوجی کو انسانیت کی روح کو مجروح نہ کرنے دیں۔ فرد کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بنانے کا موقع دیں۔ مگر فرد کو سماج کی چلتی ہوئی گاڑی میں روڑے نہ اٹکانے دیں۔ مذہب کی بنا پر منافرت کو ختم کریں۔ فسادات کا سلسلہ سخت اقدامات سے روک دیں۔ ذات پات اور علاقے کی پاسداری کے بجائے پورے ملک اور ساری قوم کا درد پیدا کریں، یوم جمہوریت کے موقع پر ہمیں اپنے سے یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے ملک کی جمہوریت کو حقیقی معنوں میں جمہوریت بنائیں گے اور اسکے راستے ہر دشواری کو دور کریں گے۔ ہم دوسرے کا منہ نہ تکیں گے بلکہ اپنا فرض ادا کریں گے اور پھر اپنے حقوق پر بھی اصرار کریں گے، مشکلات سے گھبرائیں گے نہیں بلکہ ان کو حل کریں گے، تبدیلی سے خائف نہ ہوں گے بلکہ تبدیلی کو زندگی کا قانون سمجھ کر اسے آج کے پریشان اور زخم خوردہ انسان کے لیے رحمت بنائیں گے۔ ہم یہ کام کر سکتے ہیں، نہ کریں گے تو قصور ہمارا ہی ہوگا۔

Anjuman Taraqqi Urdu (Hind) LIBRARY

الکشن اور اُردو

خوشی کی بات ہے کہ لوک سبھا کے الکشن کے موقع پر اردو کا چرچا بھی ہوا ہے، تمام سیکولر پارٹیوں نے اردو کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور اس کی تعلیم کے لیے سہولتیں دینے کا وعدہ کیا ہے جن سنگھ نے بھی اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لیے اردو کے لیے سہولتیں دینے کی بات کی ہے گو اسی سانس میں یہ بھی کہا ہے کہ وہ اتر پردیش، بہار اور دہلی میں اسے سرکاری زبان تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تمام پارٹیوں نے اپنے پوسٹر اور اعلانات اردو میں بھی شائع کیے ہیں، اردو کے کچھ نئے اخبار بھی اس زمانے میں نکلے ہیں، خدا کرے یہ اخبار جاری رہیں اور چند دن کے بعد دم نہ توڑ دیں، یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ کچھ حلقوں میں ووٹروں کی فہرستیں اردو میں بھی تیار ہوئی ہیں، چیف الکشن کمشنر نے اعلان کیا ہے کہ اتر پردیش کے جو بیس حلقوں میں ہندی کے علاوہ اردو میں بھی ووٹ کے پرچے ہوں گے۔ دہلی میں ہندی کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی ہوں گے، کشمیر میں ووٹ کے پرچے اردو میں ہوں گے یہ سب باتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ تمام سیاسی پارٹیوں کو اس بات کا احساس ہو چلا ہے کہ جب تک اردو کے ساتھ انصاف نہ ہوگا اردو دوستوں کی بے اطمینانی اور شکایت دور نہ ہوں گی مگر الکشن کے موقع پر کچھ وعدے کر لینا یا ووٹ کے سلسلے میں کچھ سہولتیں فراہم کرنا کافی نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں عملی اقدامات ہوں، ابتک تو یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمدردی کے باوجود برسر اقتدار پارٹی اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے وہ قدم نہیں اٹھا پاتی جس کی صراحت دستور کی دفعہ ۳۴۷ میں موجود ہے۔ پھر مخالف

پارٹیوں نے برسر اقتدار پارٹی کو اس سلسلے میں مطعون تو کیا اور اس کوتاہی کو یاد دلا کر اپنے لیے فضا تو ہموار کی، مگر جب ان میں سے بعض کو مخلوط وزارتوں میں کچھ کام کرنے کا موقع ملا تو ان کے وعدے بھی باطل ثابت ہوئے اس لیے ہم یہ بات صاف صاف کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب تک اردو کی تعلیم اور چلن کے لیے تمام سہولتیں جو ملنی چاہئیں فراہم نہ ہوں گی، اس وقت تک اردو دوست مطمئن نہ ہوں گے اردو دوستوں کو اب صرف وعدوں پر نہیں بہلایا جا سکتا ضرورت صاف اور واضح احکام کی ہے جن کی پوری گنجائش دستور کے دفعات ۳۴۷ اور ۳۴۵ میں ہے، اس لیے یا تو صدر جمہوریہ کے حکم سے ان تمام ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے، یا ان ریاستوں کی قانون ساز مجلسیں اپنے سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم کر کے، اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرنے کے لیے گنجائش نکالیں، سرکاری زبان کا مطالبہ نام و نمود کے لیے یا کسی علیحدگی پسندی کے جذبے کے تحت نہیں ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ جب تک سرکاری طور پر کسی زبان کی تعلیم اور چلن کا تحفظ نہیں ہوتا، افسر اور کارکن من مانی کرتے ہیں، یا تنگ نظری یا تعصب کی بنا پر اردو کے حقوق کو نظر انداز کرتے ہیں بظاہر تمام سیکولر پارٹیوں کو اردو کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کا احساس ہے۔ اب جو پارٹی برسر اقتدار آئے اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدے پورے کرے اور اردو کے تحفظ کے لیے عملی اقدام اٹھائے اور اس کی تعلیم اور چلن کے سلسلے میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے سرکاری مشنری کو حرکت میں لائے ارباب نظر کے خیال میں ہوا کا رخ تو اس وقت نئی کانگریس کی طرف ہے، اس سے خاص طور سے یہ کہنا ہے کہ اتر پردیس، بہار، آندھرا، میسور، دہلی میں اردو کو سرکاری زبان تسلیم کیا جائے اور مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہریانہ، پنجاب میں اس کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے لیے مناسب سہولتیں دی جائیں مخالف پارٹیوں کا یہ فرض ہے کہ اس معاملے کو صرف پارٹی کے نقطۂ نظر سے نہ دیکھیں، بلکہ ایک قومی مسئلہ سمجھ کر اس سلسلے میں برسر اقتدار پارٹی سے تعاون کریں، اگر اردو دوستوں کے مطالبات تسلیم کر لیے گئے اور اگر نتیجے کے طور پر بعض ریاستوں میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل گیا تو اردو دوستوں

کو پورے جوش اور ولولے سے سماج کی تعمیر اور ملک کی ترقی میں حصہ لینے کا موقع ملے گا۔ اردو دوست خود بھی اپنے پورے قد کو پہنچیں گے۔ اور ملک کے قد کو بھی بلند کریں گے۔ اردو دوستوں کو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم پر ایمان رکھنے والی پارٹیوں کی حمایت کرنی چاہیے، ان کو ترقی ہوگی تو اردو کے ساتھ انصاف کے جذبے کو بھی ترقی ہوگی، اردو کے ساتھ انصاف ہوگا تو جمہوریت سیکولزم اور سوشلزم کی حمایت کا جذبہ اردو دوستوں میں اور گہرا اور توانا ہوگا۔ اس لیے ملک کی پوری تاریخ کو اپنانے والی مشترک تہذیب پر فخر کرنے والی، آگے کی طرف دیکھنے والی، ہندوستان کی کثرت میں وحدت پر اصرار کرنے والی اور اس کثرت کے ذریعہ سے وحدت رعنائی اور زیبائی پر فخر کرنے والی جماعتوں کی حمایت دراصل اردو کی حمایت ہوگی۔ انجمن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، یہ ایک ادبی اور تہذیبی ادارہ ہے، مگر وہ ادب اور تہذیب جس کی حفاظت انجمن کا نصب العین ہے، جمہوریت سیکولرزم اور سوشلرم کے ہندوستان میں فروغ اور استحکام کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتے، اسی لیے اردو دوستوں کو ان تمام طاقتوں کا ساتھ دینا چاہیے جو اس منزل کی طرف گامزن ہیں۔

اردو زندہ باد ــــــــــ ہندوستان پائندہ باد

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

"ہماری زبان" کے پڑھنے والوں کو ہم نئے سال کی مبارکباد دیتے ہیں امید ہے کہ یہ سال ان کے لیے بہت سی خوشیاں لائے گا۔

سنہ ۱۹۶۷ء پورے ملک کے لیے نئی نئی مشکلات، نئے نئے امتحان اور نئے نئے خطرے لایا۔ مشکلات، امتحانات اور خطرات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے، ان کا مقابلہ نئے اعتماد اور نئے جوش سے کرنا چاہیے۔

ہندوستان نے اپنے لیے جو راستہ انتخاب کیا ہے وہ اچھا اور سچا راستہ ہے۔ جمہوریت کا راستہ ہی زیادہ سے زیادہ انسانوں کی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے۔ یہی سب کیلیے انصاف کی ضمانت ہے اسی پر چل کر وہ اقتصادی فلاح، ذہنی بلندی اور روحانی آسودگی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں، مگر یہ راستہ ہم سے کچھ مطالبے بھی کرتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم نے جمہوریت کے دیے ہوئے حقوق پر ہی دھیان دیا ہے۔ اس کے عائد کیے ہوئے فرائض پر ہماری نظر نہیں گئی۔ ہماری مشکلات کی وجہ یہی ہے۔ اگر ہم صرف اپنی ذات کو خلاصہ کائنات سمجھتے رہیں گے، اگر صرف اپنی خوش حالی اور ترقی ہمیں عزیز ہوگی اگر صرف دنیوی کامیابی کو ہم سب کچھ سمجھیں گے اور اگر ہم ابن الوقتی کو اپنا شعار بنائیں گے تو دوسرے بھی ہماری دیکھا دیکھی یہی کریں گے۔ اس ذاتیات کی دوڑ میں سماج کا کیا حال ہوگا؟ ملک کہاں جائے گا؟ قوم پر کیا بنے گی؟ تہذیب پر کیا گزرے گی؟ انسانیت کا کیا حشر ہوگا؟ اس لیے ہمیں ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہیے، ہر دانشور کو سوچنا چاہیے کہ اس نے علم و تہذیب

کی روشنی پھیلائی ہے یا اسے اپنے کمرے میں اس طرح بند کر لیا ہے کہ اس کی ایک کرن بھی باہر نہ جائے۔ ہر ادیب کو غور کرنا چاہیے کہ کیا ادب کے ذریعہ سے اس نے اپنے سچے تجربات پیش کئے ہیں یا کسی کی دلالی کی ہے۔ اس نے زندگی کے حسن اور بدصورتی میں حسن کو دیکھا اور دکھایا ہے یا نہیں، اس نے اپنے آپ سے سچ بولا ہے یا جھوٹ، اس نے زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا ہے یا وہ کسی لکیر یا رنگ یا فارمولے میں اسیر ہو گیا ہے۔ ہر معلم کو دھیان دینا چاہیے کہ وہ اپنے پیشے سے محبت رکھتا ہے یا نہیں؟ اپنے علم میں اضافہ کرتا ہے یا نہیں؟ اور اس علم کو اور علم کی قدروں کو اپنے طالب علموں تک پہنچاتا ہے یا نہیں؟ یا وہ صرف ایک سیڑھی اور چڑھنے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور درس و تدریس کے بجائے سارا وقت سیاست اور جوڑ توڑ میں گزارتا ہے۔ ہر طالب علم کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس سنہرے دور میں جب ستاروں سے آنکھیں لڑانے اور پہاڑوں پر کمندیں ڈالنے کی عمر ہے وہ غصے میں آکر قومی سرمایے کو برباد کرنے میں اپنی شان کیوں سمجھتا ہے۔ مانا کہ اس کے بزرگوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اور اس کے لیے کوئی اچھی مثال قائم نہیں کی، مگر اس کے یہ معنی کب ہوئے کہ وہ اپنے آپ سے، اپنے مستقبل سے، قوم سے اور انسانیت سے مایوس ہو جائے اور کسی نیتا کے اکسانے پر ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کو اپنا شعار بنا لے۔

ہندوستان کا راستہ اچھا اور سچا راستہ ہے مگر ہم سیدھے راستے کو چھوڑ کر ساتھیوں سے الجھنے لگے ہیں۔ کوئی ہندی کی خدمت اس میں سمجھتا ہے کہ انگریزی کے سائن بورڈ جلا دے اور انگریزی کی ہر تحریر مٹا دے۔ کوئی انگریزی کے نام پر ہندی سے نفرت کرتا ہے۔ کوئی اپنی ریاست کی حدوں کی خاطر ملک کے امن و امان کو خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار ہے۔ کوئی صرف اپنی تجوری بھرنے کی فکر میں ہے۔ اسے اس کی فکر نہیں کہ لوگ غذا کی کمی کی وجہ سے بھوکے مرنے لگے ہیں، سیاسی پارٹیاں اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہر ترکیب برتنے کو تیار ہیں۔ سرکاری افسر اپنے کو خداوند مجازی سمجھنے لگے ہیں۔ گاندھی جی کا نام لینے والے ان کے اخلاقی پیغام کو بھولتے جاتے ہیں۔ جواہر لال کی اٹھارہ سال کی حکومت پر کتنے ہی نکتہ چینی کرتے ہیں، ان کی ملک کے عوام سے محبت ان کے خیالات کی رفعت، ان کے ذہن

کی وسعت، ان کی انتھک محنت کی کوئی تقلید نہیں کرتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج آدرش، اخلاق، خدمت، محبت، تہذیب اور انسانیت کو خالی خولی الفاظ سمجھنے والے بہت ہو گئے ہیں حالانکہ وہ آدمی جو جانور تھا اور انسان بننے کی کوشش کر رہا ہے اس کا سارا سرمایہ یہی تھوڑے سے آدرش، یہی کمزور سا اخلاق، یہی خدمت کا ولولہ، یہی محبت کا جذبہ، یہی تہذیب اور انسانیت کا تصور ہے۔ آج بھی دنیا میں کچھ لوگ ان قدروں کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ ہمیں ایسے ہی لوگوں کے ساتھ چلنا چاہیے۔ تہذیب اور انسانیت، محبت اور اخلاق کے لیے ہمارے پاس روایات موجود ہیں مگر ہم نے ان روایات کو بھلا دیا ہے۔ انہیں پھر سے دلوں میں جاگزیں کرنا ہوگا۔ گاندھی کے اخلاق اور نہرو کی نظر کو پھر سے یاد کرنا ہوگا۔ تہذیب اور انسانیت کے تقاضوں کو پھر سے عام کرنا ہوگا۔ ان کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے لوگوں کی مخالفت بھی برداشت کرنا ہوگی مگر ہماری نجات اسی میں ہے۔ ہندوستان کو کوئی دوسرا ملک نہ نقصان پہنچا سکتا ہے نہ نفع۔ ہم اپنے عمل سے اسے اونچا بھی اٹھا سکتے ہیں اور نیچا بھی گرا سکتے ہیں۔ بیس برس میں ہم نے بلندی اور پستی دونوں کے رنگ دیکھ لیے اب بھی اگر ہم نہ سنبھلے تو ہمارے لیے بڑا خطرہ ہے لیکن اگر ہمیں اپنے اوپر اور اپنی قدروں پر اعتماد ہے تو ہمارا راستہ اب بھی ہمارے سامنے ہے اور ہماری منزل بھی ہمیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔ قوم افراد ہی کا تو مجموعہ ہوتی ہے۔ افراد میں عقیدے کی مضبوطی اور کردار کی پختگی پیدا ہوگی اور وہ انسانیت کی قدروں کو اپنائیں گے تو قوم بھی ترقی کرے گی۔ ہمیں افراد میں عقیدے اور عمل کی شمع روشن کرنی ہے۔ قوم کی زندگی میں اس سے چراغاں ہوگا۔

اپنے کو دوسرے کی مدد سے پہچانو

ایک نقاد کا قول ہے کہ انگریزی ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے انگلستان کے حدود سے باہر جانا پڑے گا۔ چنانچہ فرانس اور جرمنی کی ادبی تحریکوں کو سمجھے بغیر انگریزی ادب کا عرفان مشکل ہے اسی طرح اردو ادب کو ترقی دینے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریزی، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی، بنگالی ادبیات میں سے کچھ کا علم رکھتے ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ جب شمالی ہند میں اچھے ادیب اور عالم فارسی، عربی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی بھی جانتے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو عبرانی اور سریانی بھی سیکھی تھی۔ ہمارے خیال میں اردو ادب میں دستگاہ کے لیے فارسی اور ہندی دونوں پر خاصا عبور ہونا چاہیے۔ اور انگریزی ادب نے جو معیار اور پیمانے دیے ہیں ان سے آشنا ہونا چاہیے۔ ہمارے اچھے ادیب عام طور پر فارسی اور انگریزی جانتے ہیں مگر ہندی ادب سے واقفیت اتنی گہری نہیں ہے اور سنسکرت سے تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ انگریزی ادب سے جس کو کما حقہٗ واقفیت ہے ان کی فارسی کے ادب پر گہری نظر نہیں ہے جو عربی و فارسی جانتے ہیں وہ انگریزی برائے نام جانتے ہیں اسی وجہ سے عام طور پر اس دور کے لکھنے والوں کے یہاں زبان پر پوری قدرت نہیں ملتی اور اسی وجہ سے یا تو جو مطلب ایک جملے میں ادا ہو سکتا ہے وہ کئی سطروں میں بیان ہوتا ہے یا الفاظ کا بیان اتنا ناقص ہوتا ہے کہ کہنے والا کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ کچھ اور جاتا ہے۔ الفاظ پر قدرت کے لیے ہمارے خیال

میں ہندی اور فارسی سے اچھی طرح واقف ہونا کافی ہوگا لیکن خیالات اور اسالیب کا علم ایک طرف کچھ مغربی زبانوں کے ذریعے سے اور دوسری طرف کچھ ہندوستانی زبانوں کے ذریعے سے آسکتا ہے۔ ٹیگور کی تصانیف کا براہ راست بنگالی سے اردو میں ترجمہ کرنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح دوسری ہندوستانی زبانوں کے ایسے فاضل جن کی اردو مادری زبان ہو کم ہی ملیں گے۔ ہمیں اس کمی کو دور کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہونا ہے کہ اردو میں روسی، چینی، ہسپانوی زبانیں جاننے والے اور قدیم زبانوں میں یونانی اور لاطینی جاننے والے بھی خاصی تعداد میں ہوئے۔ عام طور پر جب ترجموں کا سوال آتا ہے تو ہمیں انگریزی تراجم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزی میں دوسری زبانوں سے بڑے اچھے ترجمے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ان ترجموں میں اصل کی خوبی کی جھلک ہی آسکتی ہے براہِ راست ترجموں کی بات ہی اور ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ مغربی زبانوں میں جرمن اور فرنچ جاننے والے ہمارے یہاں خاصی تعداد میں ہیں اور ان لوگوں نے جو براہ راست ترجمے کیے ہیں وہ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہیں لیکن یہ توقع بے جا نہیں کہ دنیا کی جتنی اہم زبانیں جاننے والے ہمارے یہاں ہوں پھر اس کی بھی ضرورت ہے کہ جس طرح سجاد حیدر نے ترکی ادب کی روح اردو میں پھونکی اسی طرح ایسے لکھنے والے ہوں جو ہسپانوی، اطالوی، چینی، روسی، ناروجین زبانیں اچھی طرح جانتے ہوں اور ان کے افکار و اسالیب کو اردو میں منتقل کرسکیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو زبان کی خدمت کے لیے صرف اردو جاننا کافی ہے انہیں کسی شاعر کا یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ جس نے صرف انگلستان سے محبت کی اس نے انگلستان کو نہیں پہچانا۔

(ہماری زبان، علی گڑھ۔ ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء)

ٹیگور کی یاد میں

۸ مئی سے سارے ملک میں ٹیگور کا خراج عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ دوسرے ملکوں میں بھی ادیبوں اور دانشوروں کے جلسے ہو رہے ہیں اور ٹیگور کے گن گائے جا رہے ہیں۔ ٹیگور یوں تو بنگال کے فرزند تھے، مگر دراصل پورے ہندوستان کو ان پر فخر ہے، انہوں نے نہ صرف بنگالی ادب کو عظمت اور شان عطا کی، بلکہ ہندوستان کا نام اونچا کیا۔ وہ اتنی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت رکھتے تھے کہ ان کے کارناموں کا جائزہ چند مضامین تو کیا چند کتابوں میں بھی پوری طرح نہیں لیا جا سکتا۔ ہاں ان کی عظمت کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے اور یہی ان سطروں کا مقصد ہے۔

ٹیگور شاعر تھے اور بڑے شاعر۔ ان کی نظموں میں خوابوں کے وہ رنگ محل ہیں جن سے انسانیت کا حسن باقی ہے۔ ان میں وہ ترنم ہے جس سے روح کے تار بج اٹھتے ہیں۔ فطرت کا وہ عرفان ہے جو سچی اور گہری پرستش سے آتا ہے، زندگی کے تسلسل کا وہ احساس ہے جو ماضی، حال، مستقبل میں ایک معنی خیز رشتہ پیدا کرتا ہے۔ ان کے الفاظ میں بنگال کے دریاؤں کا تموّج، وہاں کی ہریالی، وہاں کے پھولوں اور پودوں کی خوشبو، وہاں کے جنگلوں کی موسیقی اور وہاں کے باسیوں کی خواب آلود بیداری سب سما گئی ہے۔ انہوں نے بہت سے گیت بھی لکھے اور طویل نظمیں بھی۔ پھر ان کی مضطرب روح نے صرف شاعری کی فضا میں پرواز کو کافی نہیں سمجھا۔ نثر کے ذریعہ سے دھرتی پر چلنے اور زندگی کے دکھ درد کو سمجھانے

کی بھی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی کہانیوں، ناولوں اور ڈراموں میں بنگال اور ہندوستان کی ساری ستم دیدہ مگر لائق ستائش مخلوق سمو دی۔ آرزوؤں اور امیدوں کے کتنے سہانے گیت، حسرتوں اور ناکامیوں کے کتنے زخم، روحانیت اور انسانیت پر اعتقاد کے کتنے پھائے، علم و حکمت کے کتنے نسخے، ان تصانیف میں آگئے ہیں اور کیسی خوبی سے آئے ہیں۔

پھر ٹیگور نے شعر و ادب کو من کی موج نہیں سمجھا۔ اس کی خاطر کسی نوریں گنبد میں مقید ہو کر نہیں بیٹھے، بلکہ فنون لطیفہ کی ترویج کے ذریعہ سے پیاسی اور ترسی ہوئی روحوں کو سیرابی اور سرشاری عطا کرنے کی کیسی برگزیدہ مہم چلائی، تعلیم کو بے روح ہوتے ہوئے دیکھا تو شانتی نکیتن میں شاداب روحوں کی بستی قائم کی۔ مشرقیت کو محدود پایا تو مغرب سے علم کی نئی کرنیں لیں۔ مغرب کو میکانیکی اور جابر دیکھا تو اسے مشرق کی روحانیت کا درس دیا۔ سیاست دانوں کو اعلیٰ مقاصد سے آشنا کیا۔ وطنیت سے بین الاقوامیت اخذ کی، مذہب کو فصل کے لیے نہیں وصل کے لیے برتا۔ تعلیم میں تجربے کیے، ہر نئی کرن کو آنکھوں میں جگہ دی، مگر اپنے آفتاب اور مہتاب کو سینے سے لگائے رہے۔ شاعری کو اس عاشق نے واقعی جزویست از پیغمبری بنا دیا۔

ٹیگور سے آج مہذب دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ ان کی تصانیف کے تراجم تمام بڑی بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ ان کی عظمت کو ساری دنیا مانتی ہے، مگر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود ہندوستان میں ان سے عقیدت ضرور ہے مگر ان کی تصانیف کا علم کم ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ٹیگور کی نظموں کا ہی مطالعہ نہ کریں بلکہ ان کے افسانوں، ناولوں اور ڈراموں کو بھی دیکھیں اور ان کے مضامین سے بھی استفادہ کریں۔ ٹیگور کا اثر یوں تو ہر ہندوستانی زبان پر ہوا ہے، اور اردو زبان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، مگر یہ اثر صرف گیتان جلی کے شاعر ٹیگور کا ہے اور ٹیگور صرف گیتان جلی کا شاعر نہیں۔ وہ شاعر اعظم ہے۔ اردو میں پریم چند ضرور ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں ٹیگور کا اثر نمایاں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیگور کے بیشتر افسانے یا ڈرامے ہندی کے معمولی ترجموں کے ذریعے سے اردو دانوں تک پہنچے ہیں، اور ان کی نظموں کے ترجمے بیشتر انگریزی سے کیے گئے ہیں۔ اردو تراجم میں صرف ضیاء الدین نے براہ راست بنگالی سے نظموں کے ترجمے کیے ہیں۔ اور یونس احمر نے افسانوں کو براہ راست بنگالی سے

منتقل کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ساہتیہ اکاڈمی امسال ٹیگور کی تصانیف کے ترجمے تمام ہندوستانی زبانوں میں شائع کر رہی ہے جن میں سے بیشتر بنگالی سے کیے گیے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کے مطالعے سے اردو داں طبقہ بھی ٹیگور کی حقیقی عظمت کو پا سکے گا۔

ٹیگور ہمارے لیے روشنی کے ایک مینار ہیں۔ ان کی وطنیت ہمیں وطنیت کے محدود اور جارحانہ تصور سے بلند کرتی ہے۔ ان کی انسان دوستی ہمیں آفاقیت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ان کے یہاں مقامی فضا اور مقامی رنگ ہمیں اپنی دھرتی سے اپنا رشتہ استوار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ ان کے تعلیمی تجربے آج بھی ہمارے تعلیمی اداروں کی پھیکی اور بے جان فضا میں نیا رنگ و آہنگ دے سکتے ہیں۔ ان کی جامعیت ہمیں سکھاتی ہے کہ شاعری کو نثر اور علوم اور تنقید سب سے مدد ملتی ہے اور فنون لطیفہ سے آشنا ہونا اس میں اور بھی بلندی پیدا کرتا ہے، مگر بڑی بات یہ ہے کہ ان کی زندگی، شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک دعوت ہے، زندگی اور ماحول کی ہر کروٹ سے متاثر ہونے کی اور سیاسی گروہ بندیوں میں گرفتار نہ ہوتے ہوئے سیاسی شعور رکھنے اور سیاست کی روح کو سمجھنے اور سمجھانے کی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ انکے مطالعے سے ہمیں زندگی اور انسانیت سے کسی حال میں مایوس نہ ہونے کی صلاحیت ملتی ہے اور آج کے دور میں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے کہ انسان مایوس نہ ہو، یعنی اپنا سب کچھ لٹانے یعنی "ٹھکانے لگانے" کے لیے تیار رہے۔

پیرِ مُغاں کی یاد میں

۲ر اکتوبر کو سارے ملک میں گاندھی جینتی منائی جا رہی ہے۔ اس دن تمام دفاتر اور ادارے بند ہوں گے ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک جلسے ہوں گے جن میں مقرر گاندھی جی کی تعلیم، ان کی سیرت اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالیں گے۔ ریڈیو پر گاندھی جی کے محبوب گانے سنائے جائیں گے۔ ان کی وہ نحیف مگر صاف آواز جن میں سچائی اور عدم تشدد پر بھرپور اعتماد تھا، ہوا میں گونجے گی۔ کچھ لوگ یہ یاد کر کے بڑے ہونے کی کوشش کریں گے کہ انہوں نے اس اولیا صفت انسان کے سائے میں کچھ دن گزارے تھے۔ دنیا کو پیام دیا جائے گا کہ اس کی مشکلات کا حل گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنے میں ہے اور اس تھوڑی سی مصروفیت اور سستے سے خراج کے بعد سب اپنے روزمرہ کے دھندوں میں لگ جائیں گے۔ وہی فرقہ پرستی کا کھیل، وہی ذات پات کا لحاظ، وہی زبان کے جھگڑے، وہی علاقوں کی چشمکیں، وہی عہدوں، منصبوں کے لیے چھین جھپٹ، وہی چناؤ کے نقشے، وہی ٹکٹ کے لیے داؤ پیچ، وہی روپیہ بٹورنا، وہی بے حسی، وہی کچلے ہوئے اور ستائے ہوئے انسانوں کے جسموں پر سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچنا۔

لیکن اس وقت جب کہ دہلی میں قومی وحدت کے مسئلے پر ملک کے سیاست داں ماہرین تعلیم، فنکار، ادیب، سائنس داں اور دوسرے قومی کارکن، سر جوڑ کر گفتگو کر رہے ہیں، کیا انہیں سامنے کی بات نظر آئے گی یا نہیں۔ ہم نے گاندھی جی کا برابر نام لیا ہے، مگر ان کی تعلیم برابر نظر انداز کر دیا ہے۔ ہم نے انہیں دیوتا صفت کہا ہے مگر ان کی انسانیت کو بھول گئے ہیں۔ ہمیں یہ اب

کچھ یوں ہی سایاد ہے کہ وہ کس مقصد کے لیے زندہ رہے اور کیوں انہوں نے جان دی۔ کیوں جب ملک آزاد ہوا تو وہ دہلی کے ہجوم میں خوشی کے گیت گانے کے بجائے اور عوام سے خراج عقیدت وصول کرنے کے بدلے بنگال کے دیہات میں مارے پھرتے رہے۔ گاندھی جی کی سچی یادگار بڑے شہروں کی وہ جگمگاتی شاہراہیں نہیں ہیں جو ان کے نام سے موسوم کی گئی ہیں۔ نہ راج گھاٹ کی وہ زیارت گاہ ہے جہاں پر سرکاری مہمان آکر پھول چڑھاتا ہے۔ ان کی یادگار، انکی زندگی، ان کا عمل اور ان کا خلوص ہے۔ اس کو ہم نے کتنا یاد رکھا ہے۔ ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ بیرونی ملکوں میں گاندھی جی کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ ہم نے گاندھی جی کے گھر میں ان کی واقعی عزت کتنی کی ہے۔ کیا سچائی اتنی خطرناک ہے کہ نہ صرف اس کے پیرو شہادت پاتے ہیں، بلکہ ان کی تعلیم محض احترام کی نذر ہو جاتی ہے۔ وہ زندگی کے لیے نمونہ اور مثال نہیں بن پاتی۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قومی رہنما لمبی چوڑی اسکیمیں بنائیں گے۔ خوب صورت اور شاندار الفاظ میں قومی وحدت کا ذکر کریں گے۔ اور اس کثرت کی طرف بھی اشارہ کریں گے جو اس وحدت کی شان اور آبرو ہے۔ وہ سیاسی پارٹیوں سے اپیل کریں گے کہ چناؤ کے موقع پر ذات پات کی، لسانی جھگڑوں کی، فرقہ پرستی کی، علاقائی جانب داری کی آگ کو ہوا نہ دیں۔ وہ تعلیمی اداروں سے کہیں گے کہ اپنے نصاب کی اصلاح کریں۔ وہ حکومت اور عوام کو اور بھی بہت سی اچھی اچھی نصیحتیں کریں گے، مگر کاش وہ یہ سب کرنے کے بجائے گاندھی جی کی تعلیم پر واقعی عمل کرتے، کاش وہ قومیت کے جذبے سے خود شرشار ہوتے، کاش فرقہ پرستی خواہ اکثریت کی ہو یا اقلیت کی، یکساں مذموم قرار پاتی۔ کاش فساد برپا کرنے والوں کو واقعی محسوس ہوتا ہے کہ وہ کتنا خطرہ مول لے رہے ہیں، کاش بڑے عہدوں والے بھی اپنی برادری، اپنی ذات، اپنے علاقے کے لوگوں کو ان کے حق سے زیادہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتے۔ کاش ایک زبان کے نام پر دوسری کی پامالی نہ ہوتی، کاش جمہوریت کے یہ معنی نہ لیے جاتے کہ جمہوری عناصر کو ختم کرنے والے اپنے ناپاک منصوبوں میں مصروف رہیں اور کوئی انکا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ کاش افسر ایک دوسرے کو بچانے اور برادری کی ناک سلامت رکھنے کے اتنے قائل نہ ہوتے۔ کاش سیدھے سادے عوام کو یہ باور نہ کرایا جاتا کہ بات تو قومی وحدت

کی کرتے رہو مگر عمل میں برہمن، کائستھ، ٹھاکر، شیعہ، سنی، سکھ ، پارسی پر نظر رکھو۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ٹھیک کہا ہے کہ کچھ لوگ جو نام قومی وحدت کا لیتے ہیں، دراصل اس وحدت کو مجروح کرتے ہیں۔ وہ ہندی کے نادان دوست جو ہندی کے علاقوں میں مصنوعی اور مشکل ہندی رائج کر رہے ہیں اور دوسرے علاقوں میں اپنی چودھراہٹ علاقائی زبانوں کے اوپر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اردو والے جو اردو کے ساتھ بے انصافی کا اس طرح تذکرہ کرتے ہیں گویا اکثریت نے اردو کو ختم کرنے کے لیے ایک خطرناک پلاٹ بنایا ہے اور وہ اردو کو ختم کر کے ہی دم لے گی، وہ پنجابی والے جنہیں صرف پنجابی صوبے سے غرض ہے، خواہ اس کے نتیجے میں ملک کا کتنا ہی نقصان ہو، وہ آسام والے جو بنگالی سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ایک زمانے میں بنگالی بولنے والے ان کے یہاں چھائے ہوئے تھے۔ یاد رکھیے پانی کہاں کہاں مرتا ہے۔

ہمارے وطن میں جتنی قومی زبانیں ہیں سب کی ترقی کی گنجائش ہے۔ ان کی ترقی سے ملک کو فائدہ ہوگا۔ آزاد ہندوستان حال کے حقائق کو تسلیم کر کے اور مستقبل میں سب کے امکانات محفوظ کر کے ہی ترقی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے گاندھی جی کا سا ذہن بنانا پڑے گا۔ ہر شخص کو اپنے طور پر گاندھی بننا پڑے گا اور قومیت کے فروغ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔ گاندھی جینتی کا حقیقی پیغام یہی ہے۔

اقبال کی یاد میں

اقبال کے انتقال کو اکتیس برس ہوگئے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد ان کی شہرت اپنے عروج پر تھی وہ عام طور پر اردو کے بہت بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور کچھ لوگ تو انہیں اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ آزادی کے فوراً بعد ایک طرف پاکستان میں ان کی پرستش شروع ہوئی دوسری طرف ہندوستان میں ان کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ لیکن آزادی کے بائیس سال کے بعد ہم اقبال کے متعلق زیادہ معروضیت کے ساتھ سوچ سکتے ہیں اور ان کی شاعری کے متعلق بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب ان کی شخصیت کے اور ہمارے درمیان وقت کا خاصا فاصلہ ہوگیا ہے۔ ادب میں یہ فاصلہ بھی غیر جانب داری برتنے میں اور انصاف کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اقبال اس ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی پیداوار ہیں جس نے مغرب کے اثر سے ہمارے ملک میں ایک نئی مشرقیت کو جنم دیا۔ مغرب کے اثر کے بغیر ہم اقبال کو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کی نئی مشرقیت کو ماضی پرستی کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا، یہ عصر حاضر سے ایک نئے مفاہمہ کی کوشش ہے۔ اکرام نے ٹھیک کہا ہے کہ اقبال کو اقبال مغرب نے بنایا اقبال سنگھ نے اپنی کتاب "پرجوش زائر" میں اس اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال کو ایک کرب کے ساتھ حال کا احساس تھا۔ اس نئی مشرقیت میں اوّل اوّل قومیت کا ایک رومانی تصور تھا۔ مگر کیسا پرجوش اور دردانگیز تصور، اقبال سے اس نے ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت تصویر درد اور نیا شوالہ، جیسی نظمیں لکھوائیں۔ ان نظموں میں بڑے خلوص سے باہمی محبت کو سارے فرقہ وارانہ اختلاف کا حل بتایا گیا تھا۔ جب اقبال ۱۹۰۵ء میں یورپ پہنچے تو وہاں کے علمی حلقوں میں انیسویں صدی

کی عقلیت اور سائنسیت کے خلاف بغاوت بڑھ رہی تھی اور یہ جذباتی بغاوت نطشے اور برگساں کی مقبولیت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ ذہنی بغاوت جو مارکسیت کے فروغ میں ظاہر ہوئی اس کے بعد رونما ہوئی۔ اقبال نے یورپ میں جارحانہ قومیت اور سرمایہ دارانہ تمدن کے بہت سے رنگ دیکھے اور اس وجہ سے نتشے اور برگساں سے متاثر ہوئے اور جارحانہ قومیت کے بجائے ایک ایسے اخلاقی نظام پر زور دینے لگے جو ساری دنیا کے لیے ہو۔ قدرتی طور پر اس نظام کے خط و خال انہیں اسلام میں نظر آئے اور اس لیے یورپ سے واپس آکر انہوں نے جہاں فلسفۂ خودی پر زور دیا جس کے ذریعہ سے فرد اپنی شخصیت کی تکمیل کر سکتا ہے، وہاں اس فرد کی خودی کو ایک اجتماعی نظام کی بیخودی سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی اور اس اجتماعی نظام کے لیے انہوں نے اسلام کے بنیادی تصورات سے کام لیا۔ چنانچہ بانگ درا کے تیسرے دور کی شاعری میں جہاں ان کے یہاں والدہ مرحومہ کی یاد میں ایک ایسی نظم ملتی ہے جس میں حیات و موت کے فلسفے پر غور کیا گیا ہے اور زندگی کے تسلسل پر زور دیا گیا ہے وہاں خضر راہ جیسی عہد آفریں نظم بھی سامنے آتی ہے جس میں اردو میں پہلی دفعہ سرمایہ و محنت کی آویزش اور پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یعنی اس دور میں اقبال ایک ایسے شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں جو زندگی کا ایک بلند تصور رکھتا ہے جو حیات کے تسلسل کا قائل ہے، جو فرد کی شخصیت کی تکمیل پر زور دیتا ہے، جو عصر حاضر کے مسائل اور میلانات سے واقف ہے، اور جو زندگی کے لیے ایک جامع نظریے کی ضرورت محسوس کرتا ہے یہ کام اقبال سے پہلے دوسرے بڑے شاعر، اپنے اپنے زمانے میں کرتے رہے ہیں، کالی داس دانتے، شیکسپیر، ملٹن، گوئٹے سبھی ایک آفاقی ذہن رکھتے تھے، قدرتی طور پر یہ کسی نہ کسی خاص مذہبی نظریے سے متاثر تھے۔ مگر ان کا ذہن آفاقی تھا ان کے بلند تخیل اور گہرے تجربے نے اپنی اپنی زبان میں مناسب اور موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ایک مربوط، پیچیدہ اور محسوس صداقت کو پیش کیا تھا یہی کام اپنے دور میں اقبال نے کیا۔ اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لیے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کے مذہبی نظریے سے اتفاق کریں وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر نہیں ہیں وہ اس مذہبی نظریے کی وجہ سے بڑے شاعر کے درجے سے خارج بھی نہیں کیے

جاسکتے کسی پرخلوص، گہرے، مربوط اور پیچیدہ تجربے کا اعتراف کرنے کے لیے اس تجربہ سے اتفاق ضروری نہیں ہے۔ دانتے اور ملٹن اور گوئٹے کے مذہبی نظریات سے اتفاق کیے بغیر ہم ان کی عظمت کو تسلیم کرسکتے ہیں اس طرح اقبال کی عظمت کے اعتراف کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کے یہاں بلند تخیل، گہرا تجربہ، اپنے اس گہرے تجربے سے مکمل وفاداری اور اس کے اظہار کے لیے مناسب اور موزوں اظہار یعنی استعاراتی اور علامتی اظہار ملتا ہے اقبال نے فارسی میں بہت کچھ کہا مگر بانگ درا کی چند نظموں کے علاوہ بانگ درا کی تقریباً ایک درجن نظمیں اور اتنی ہی غزلیں اور ضرب کلیم کی آدھی درجن نظمیں اعلیٰ شاعری اور آفاقی شاعری کا ایسا نمونہ پیش کرتی ہیں جن پر اردو زبان فخر کرسکتی ہے۔ مسجد قرطبہ کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ سر تیج بہادر سپرو نے اسپین میں لکھے گئے ان کے اشعار کے حوالے سے درست کہا تھا کہ یہ شاعری سب کے لیے ہے اس لیے آج ہمیں مذہبی اور سیاسی نظریات کی بنا پر شاعروں کی عظمت متعین نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے یہاں پرخلوص اور گہرے تجربے اور اس تجربے کی صداقت اور پیچیدگی اور اس کے اظہار کی فنی خوبی پر نظر رکھنی چاہیے اقبال ایک آفاقی شاعر ہیں ان پر اردو زبان کو فخر ہے مگر اس کے لیے ان کے سیاسی خیالات سے اتفاق ضروری نہیں، ان کے فن کے کمال اور فن کے ایک برگزیدہ اور جامع تصور کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اقبال کی شاعری سے آج بھی ہمیں گرمی اور روشنی مل سکتی ہے ہاں یہ گرمی اور روشنی، اظہار کے لیے آج کے سانچوں سے کام لے گی۔

(۲)

رومین رولاں نے کہا ہے کہ "بڑا ادیب یا شاعر ساری دنیا کی ملکیت ہوتا ہے"۔ اقبال چونکہ ایک بڑے شاعر ہیں اس لیے وہ بھی ساری دنیا کی ملکیت ہیں۔ کسی ایک ملک کا ان پر اجارہ نہیں۔

اقبال کو کچھ لوگ اس لیے بڑا شاعر کہتے ہیں کہ انہوں نے فلسفہ نظم کیا ہے۔ کچھ لوگ ان کے اس لیے قائل ہیں کہ وہ حرکت یا امید کا پیغام دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک چوں کہ

ان کی شاعری مسلمانوں کو بیدار کرتی ہے اس لیے قابل قدر ہے حالانکہ بڑے شاعر کے یہاں صرف موضوع کی اہمیت نہیں ہوتی۔ موضوع اور اسلوب دونوں کے اس طرح حل ہو جانے کی اہمیت ہوتی ہے کہ ایک غیر فانی کارنامہ وجود میں آجائے۔

اقبال اپنے مذہبی یا فلسفیانہ یا سیاسی خیالات کی وجہ سے اہم نہیں۔ شاعری مذہب یا سیاست یا فلسفہ کا بدل نہیں۔ اس کی اپنی اہمیت ہے کیونکہ وہ ایک ایسی بصیرت عطا کرتی ہے اور ایک ایسی نظر دیتی ہے جو زندگی میں اپنی الگ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے انسان اور اس کے مسائل کو شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا اور شاعری کو جو عام طور پر حدیث حسن و عشق سمجھی جاتی تھی صحیفۂ کائنات بنا دیا وہ انیسویں صدی کے آخر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جو مغرب کے اثر سے مشرق کو نئے سرے سے دریافت کر رہا تھا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے نظم کو نئی ترقی دی اور اسے ہر خیال کے اظہار کے قابل بنا دیا۔ پھر انہوں نے ہندوستان کی عظمت کے ترانے گائے۔ فطرت کے حسن کی عکاسی کی اپنے دور کے اہم واقعات کی دائمی معنویت واضح کی، ماضی و حال کے رشتہ پر روشنی ڈالی، قوموں کی تاریخ کا عطر پیش کیا اور یہ سب ایسے الفاظ میں پیش کیا جو ذہن پر ایک غیر فانی نقش چھوڑتے ہیں۔ اقبال کو آج کل کچھ صرف ان کے خیالات کی وجہ سے اچھا یا برا کہتے ہیں۔ حالانکہ شاعر کے خیالات سے اتفاق ضروری نہیں، صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ شاعر نے جو ذہنی تصویریں پیش کی ہیں ان میں ربط اور معنویت ہے یا نہیں؟ ہومر، کالی داس، دانتے، ملٹن کے خیالات سے آج اتفاق مشکل سے کیا جا سکے گا۔ مگر ان شعراء کی اہمیت اور معنویت اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں ایسی ذہنی تصویریں دیتے ہیں جن سے ہمیں آج بھی مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اقبال کے ساتھ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بے انصافی ہوئی ہے ہندوستان میں ان کا نام لیا جائے تو کچھ لوگ انہیں پاکستان بنانے والا کہہ کر نظر انداز کرتے ہیں اور پاکستان میں اسی وجہ سے ان کی پرستش ہوتی ہے مگر ان کا عرفان نہیں ہے نہ ان کی نئی مشرقیت کا احساس ہے اور نہ مغرب کے خلاف ان کے اعلان جنگ کی روح کو سمجھا گیا ہے۔

اس لیے ضرورت ہے کہ اقبال کی شاعری کی خصوصیات کو اور واضح کیا جائے۔ ان کے یہاں جو استعارے اور تشبیہیں ہیں جو بلاغت ہے، جو تخیل کی پرواز ہے، جو علوم کی روح ہے، جو مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی ہے اور اس کے ساتھ جو زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم ہے، وہی خاص چیز ہے اور اس کی اہمیت ہے۔

اقبال کو کچھ لوگ صرف ماضی پرست کہہ کر بھی نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ اقبال کو حال اور اس کے درد و کرب کا جو احساس تھا وہ کم لوگوں کو رہا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ آج کی زندگی اتنی پیچیدہ ہوگئی ہے اور سائنس کی ترقی اور سرمایہ و محنت کی آویزش نے ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ جب تک ہم زندگی کا ایک جامع تصور نہ پیدا کریں گے اور ماضی و حال اور مستقبل کے رشتے کو اچھی طرح نہ سمجھیں گے، اس وقت تک ہم اس زندگی کے مطالبات پورے نہ کر سکیں گے اور یا تو زندگی ہمیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گی یا ہم زندگی کے دھارے پر تنکے کی طرح بہنے لگیں گے اور ہماری اپنی کوئی حقیقت باقی نہ رہے گی۔

شاعری کی ہمارے یہاں اب تک قدر غلط وجوہ پر ہوئی ہے وہ ہمیں جمالیاتی ذوق دیتی ہے، زندگی کی بصیرت دیتی ہے، انسانی نفسیات کا محرم بناتی ہے اور انسان کے ہر رنگ سے آنکھیں چار کرنا سکھاتی ہے اقبال کی عظمت کا یہی راز ہے اور اس عظمت کا عرفان ابھی تک عام نہیں ہے۔ ہمیں اسی کی کوشش کرنی چاہیے۔

گورکی کی یاد میں

۲۸ مارچ ۱۹۶۸ء کو گورکی کا صد سالہ جنم دن تھا۔ یہ جنم دن سویت یونین کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی منایا گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے کئی شہروں اور یونیورسٹیوں میں گورکی کی یاد میں جلسے کیے گیے۔ اور اس کی عظمت کی طرف اشارے ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ۱۳ اپریل کو ایک خاص جلسہ ڈاکٹر عبدالعلیم وائس چانسلر کی صدارت میں ہوا۔ جس میں سویت یونین کی سفارت کے تہذیبی مشیر نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو ادب پر گورکی کا اثر، گورکی کے ڈرامہ نیچی پستیاں (Lower Depths) کا ایک مطالعہ، گورکی کی زندگی اور تصانیف کے کچھ پہلو، گورکی کی عظمت پر مقالے پڑھے گئے، اور تقریریں ہوئیں۔ اس کے علاوہ گورکی کی آپ بیتی کے اردو ترجمے سے کچھ اقتباسات اور اس کے ڈرامے کے انگریزی ترجمے سے ایک ٹکڑا سنایا گیا۔ روس کے ممتاز مصنفین کی تصاویر اور گورکی کی تصانیف کے اردو ہندی اور انگریزی ترجموں کی نمائش بھی کی گئی۔

گورکی ایک طرف روس کے عظیم مصنف ٹالسٹائی، داستووسکی، چیخوف کے سلسلے کو مکمل کرتا ہے اور دوسری طرف جدید روسی ادب کا پیش رو ہے اس نے جب آنکھ کھولی تو روس میں عوام کی حالت بہت خراب تھی بچپن میں اسے بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ برابر جد وجہد کرتا رہا۔ انیسویں صدی کے اختتام سے پہلے اس کی کہانیوں کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی وہ تمام انسانوں سے بڑی محبت کرتا تھا اور اس لیے جب اپنے گرد وپیش انسانوں کی پستی اور زبوں حالی دیکھتا تھا تو بہت تلخ ہو جاتا تھا، گورکی

کے معنی ہی روسی میں تلخی کے ہیں۔ شروع میں اس تلخی پر بڑے اعتراضات ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد اس تلخی کی شیرینی کا احساس ہونے لگا۔ گورکی نے نہ صرف روس کے مختلف حصوں کی سیر کی بلکہ اپنی زندگی کا خاصہ حصہ روس سے باہر فرانس اور اٹلی میں گزارا، اس کی ناول 'ماں' کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کی آپ بیتی تین جلدوں میں شائع ہوئی۔ پہلی جلد کا عنوان تھا میرا بچپن دوسری کا تربیت کا دور اور تیسری کا میری یونیورسٹیاں، کئی نقادوں کے نزدیک گورکی کی آپ بیتی اس کا شاہکار ہے، گورکی سے لینن کی خاصی دوستی ہوگئی تھی اور لینن اس کا خاصا قائل تھا۔ اسٹالن بھی اس کا خیال کرتا تھا بلکہ جب انقلاب کے جوش میں روس کے مصنفین ٹالسٹائی وغیرہ کو طاق نسیاں پر رکھنے کی تلقین کر رہے تھے اور کلاسیکل روسی ادب کو برا بھلا کہا جا رہا تھا، گورکی نے ان کی عظمت کا احساس دلایا کچھ طاقتور لوگ اس کے بھی مخالف ہو گئے تھے اور اگر اسٹالن سے اس کے ذاتی تعلقات نہ ہوتے تو اسے بھی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ گورکی کی وہ تصانیف جن میں نچلے طبقے کے افراد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جنہیں ایک بے رحم حقیقت نگاری ملتی ہے یا جن میں تمثیلی انداز میں زندگی کے مختلف پہلو پیش کیے گئے ہیں، غیر فانی ہیں۔ وہ بہت بڑا انسان دوست ہے، اسے آدمی کے ہر رنگ سے محبت ہے۔ یہاں تک کہ وہ آوارہ اور خانہ بدوش، اشخاص سے بھی محبت رکھتا ہے۔ اس کے یہاں انسان کی عظمت پر ایک ناقابل تسخیر یقین ملتا ہے۔ فن کار گورکی اور محنت کش نامہ نگار گورکی یا انقلاب روس کے مبلغ گورکی میں فرق ہے۔ اس کے وہ مضامین جن میں اس نے اشتراکی حقیقت نگاری کی تبلیغ کی ہے یا جن میں محنت کش عوام کی برتری کا اعلان کیا ہے، ایک زمانہ میں بہت مقبول تھے، مگر آج کل ان کی وہ اہمیت نہیں جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں تھی۔ بات یہ ہے کہ بڑا ادب کسی ایک ملک یا زبان کی ملکیت نہیں ہوتا، وہ عالمی سرمایے کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ گورکی کے کئی ناولوں اور افسانوں میں اور اس کی آپ بیتی میں فکر و فن ایک دوسرے میں اس طرح حل ہو گئے ہیں اور ان میں ایسی فنکارانہ حرارت ہے کہ وہ آج بھی اپنی اہمیت سبھی سے منوا لیتے ہیں۔ پھر اس کے یہاں انسان دوستی کی وجہ سے ایک آفاقیت آگئی ہے، جو ملکوں طبقوں اور مذاہب کی حد بندی سے بلند ہے۔

اردو میں گورکی کی بیشتر تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں، انگریزی سے بھی اور براہ راست روسی سے بھی۔ 'ماں'، اور 'آپ بیتی' کا ترجمہ تو دو دفعہ ہوا ہے۔ اردو ادب کی ایک یہ خوبی رہی ہے کہ وہ عالمی ادب سے برابر اثر قبول کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ٹالسٹائی، داستووسکی، چیخوف اور گورکی کے تراجم آج بھی اردو والے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہمارا تو ایمان یہ ہے کہ جو ادب دوسرے ادبیات سے بہت کچھ لیتا ہے وہی بالآخر دوسرے ادبیات کو بہت کچھ دینے کے بھی قابل ہوتا ہے امید ہے کہ عالمی ادب کے شاہکاروں کا ترجمہ اردو میں برابر ہوتا رہے گا اور پھر اردو کے شاہکاروں کا دنیا کی دوسری زبانوں میں ترجمہ بھی شروع ہو سکے گا۔ ہمیں معلوم ہے کہ غالب کے روسی زبان میں ترجمے کا کام شروع ہو چکا ہے، اور بڑے پیمانہ پر غالب کی صد سالہ برسی وہاں اور دوسرے ملکوں میں منائی جائے گی۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

(سرسیّد کی یاد میں)

۱۷ر اکتوبر سرسید کی پیدائش کا دن ہے۔ یعنی اکتوبر ۱۹۶۷ء کو سرسیّد کی پیدائش کو ڈیڑھ سو برس ہو گئے۔ سرسید کی تحریک نے اردو ادب میں انقلاب برپا کر دیا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو جدید دور کی ضروریات سے آشنا کیا، عقلیت کی شمع روشن کی، تہذیب و معاشرت کی اصلاح کی۔ رواجی مذہب اور حقیقی مذہب کے فرق کو واضح کیا۔ نئی تعلیم کے لیے راہیں نکالیں اور سچی سیاست کے آداب سکھائے اور ایک ایسی نسل تیار کر دی جس نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے خلوص اور نظر کی بدولت بڑے بڑے کارنامے انجام دیے سرسید کے کام پر مختلف لوگوں نے تنقیدیں کیں اور اپنی صلاحیت اور نقطۂ نظر کے مطابق اس کی اہمیت بھی متعین کی۔ سرسید نے بہت سی باتیں صرف اپنے دور کے لیے کہی تھیں لیکن عمومی طور پر ان کا پیام آج بھی ہمارے لیے بڑی گرمی اور بڑی روشنی رکھتا ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آج کے حالات میں اس کی اہمیت کچھ زیادہ ہی ہو جاتی ہے۔

سرسید کی ساری زندگی اور پورے کام کو ذہن میں رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری ملازمت کے زمانے میں تصنیف و تالیف کے شغل نے ان میں ایک سنجیدہ مزاج، ایک دور بین نگاہ اور قوموں کے عروج و زوال پر غور کرنے والا ایک ذہن پیدا کر دیا تھا۔ وہ زمانے کی رفتار اور زندگی کے ارتقا کے قانون کو سمجھ گئے تھے اور ان کا یہ پختہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ ماضی کی شوکت کے طلسمات میں اسیر رہنا، تباہی کا باعث ہوگا۔

دوسری بات جو ہمیں معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ انہیں نہایت بے خوفی اور بے جگری کے ساتھ اپنے عقیدے کے مطابق عمل کرنا آگیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش میں انہیں ہندوستان کے زوال آمادہ جاگیر دارانہ نظام کی شکست نظر آگئی تھی اس کے معنی یہ نہیں کہ انگریزوں کے مظالم پر ان کی نظر نہ تھی، بلکہ وہ عالمی افکار و اقدار کو جذب کرنا چاہتے تھے جو یورپ کے ذریعہ سے ہندوستان تک پہنچے اور تاریخ کے ایک اٹل قانون کے مطابق اپنے ساتھ برکتیں اور لعنتیں دونوں لائے۔ چنانچہ انہوں نے اسباب بغاوت ہند بھی لکھی اور حکومت سے تعاون پر بھی زور دیا، مگر دونوں میں وزن و وقار کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

تیسرے انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستانیوں کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً مذہب کا رواجی تصور نئے زمانے اور نئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے سے روکتا ہے اس لیے انہوں نے رواجی تصور کی خامیاں اور مذہب کے حقیقی تصور کی خوبیاں واضح کیں۔

چوتھے انہوں نے تہذیب کے محدود تصور کو بدل کر اسے ایک ایسے وسیع مفہوم میں استعمال کیا جس کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں میں فکر و عمل کی روح دوڑ گئی اور وہ حیات بخش اور حیات آفریں ہو گیا۔

پانچویں انہوں نے قدیم ادب کی کوتاہیاں واضح کر کے نئے ادب کے لیے راہ ہموار کی اور بیمار تخیل کی کرشمہ سازیوں کے بجائے حقیقت کے نیرنگ کی طرف توجہ دلائی اور مریض داخلیت کے بجائے خارجی دنیا اور ایک اصلاحی مشن کی جلوہ سامانیوں کی طرف اشارہ کیا۔

چھٹے انہوں نے شاعری اور نثر دونوں میں ابلاغ کی اہمیت پر زور دیا تاکہ چراغ سے چراغ جل سکے اور ایک ایسے اسلوب کی طرح ڈالی جس کے امکانات بڑے روشن تھے۔

ساتویں انہوں نے نئی تعلیم کی طرف توجہ دلا کر ذہنوں کو ماضی سے حال کی ضروریات کی طرف موڑ دیا۔ شروع میں انہوں نے مقامی زبانوں کے ذریعہ سے تعلیم کے اصول کی اہمیت واضح کی اور اس کے لیے کوشش بھی کی۔ مگر یورپ کے سفر کے بعد نئے علوم کے حصول کے لیے نئے ساز و سامان اور نئے ذہن کی ضرورت محسوس کی اور اس لیے انگریزی میں اعلیٰ تعلیم پر توجہ کی۔ یہاں ان کے مقصد اور ان کے طریقۂ کار کو علیحدہ کرنا ضروری ہے مقصد

اب بھی وہی رہے گا، طریقہ کار بدل جائے گا ذہن کی مکمل تربیت کے لیے اپنے اظہار کا راستہ بہتر ہے گو اس اظہار کو غذا دوسرے پیرایوں سے بھی مل سکتی ہے۔

آٹھویں انہوں نے جس مٹی کو چھوا اسے سونا بنا دیا اور اپنے گرد ایسے ایسے اشخاص جمع کر لیے جن میں سے ہر ایک آفتاب و ماہتاب تھا۔ ان اشخاص کی کاوشوں سے صحرا میں پھول کھلے اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

نویں انہوں نے صرف نئے ذہن ہی کی تعمیر پر زور دیا بلکہ نئے ادارے بنائے اور چلائے۔ وہ معمولی معمار نہیں تھے معمار اعظم تھے۔

دسویں انہوں نے اردو زبان کے چلن پر زور دیا اس کی راہ سے کانٹے ہٹانے کی کوشش کی اور اس کے ادب کو جدید علوم سے آشنا کرایا۔

آج اس معلم، مفکر، مصلح، ادیب، صحافی، عالم، ذہنی رہنما کا پیغام ہمارے لیے کیا ہے؟ یہ وہی ہے جسے اقبال نے اپنی نظم "پیر رومی و مرید ہندی" کے آخر میں پیش کیا ہے۔

مرید ہندی کہتا ہے ؎

ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہل دل اس دیش میں ہیں تیرہ روز

پیر رومی جواب دیتا ہے ؎

کار مرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است

میر ولایت حسین کی آپ بیتی

چند روز ہوئے مجھے میر ولایت حسین صاحب کی آپ بیتی دیکھنے کا موقع ملا۔ میر صاحب علی گڑھ والوں کے لیے ایک ایسی شخصیت تھے جن کا نام آتے ہی فرض شناسی، ایثار، خدمت، خلوص، محنت، کی کتنی ہی رنگا رنگ تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی تھیں میں جب ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ آیا تو کچھ عرصہ کے بعد میر صاحب سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی خصوصیات کا تذکرہ سن چکا تھا۔ آفتاب ہوسٹل کی تعمیر کے وقت میر صاحب روز وہاں نظر آتے تھے اور ڈپٹی حبیب اللہ کے دست راست تھے۔ جب وہ کسی محفل میں پہونچتے تو سب احترام اور عقیدت سے ان کا استقبال کرتے سادہ سے مزاج کے کچھ بدصورت سے آدمی تھے، سادہ وضع سے رہتے تھے، بات کم کرتے تھے مگر رائے نپی تلی دیتے تھے ان کا یہ لطیفہ علی گڑھ میں مشہور تھا کسی بڑے آدمی کو سپاس نامہ پیش کیا جانے والا تھا میر صاحب نے کہا بھائی بات تو ذرا سی ہوتی ہے یہ آپ لوگ کس طرح اسے پھیلا کر پورے صفحے پر لکھ دیتے ہیں اور فریم میں جڑا کر اسے پیش کر دیتے ہیں کمال ہے"۔ یہ اس واقعی بڑے آدمی کی ان چھوٹے آدمیوں پر ایک لطیف انداز میں طنز تھی جو نام نہاد بڑے آدمیوں کو سپاس نامے پیش کر کے خوش ہوتے ہیں۔

اب سید محمد ٹونکی صاحب کی عنایت سے میر صاحب کی آپ بیتی شائع ہو گئی۔ ٹونکی صاحب نے اپنے پیش لفظ میں درست فرمایا ہے کہ ہماری سوسائٹی پوزیشن زدہ ہے میر صاحب کی آپ بیتی کا مسودہ کئی بڑے آدمیوں کے پاس رہا چونکہ میر صاحب کی آپ بیتی شائع کرنے سے نہ حکومت خوش ہوتی نہ لیڈر، نہ اونچی سوسائٹی کے لوگ، اس لیے اس کی

اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ کسی وائس چانسلر نے بھی اس طرف توجہ نہ کی۔ بہرحال ہم سب کو ٹونکی صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کی ترتیب و تسوید کے بعد علی گڑھ کے ایک مایۂ ناز فرزند اور ایک بہت بلند مرتبہ انسان کی آپ بیتی منظر عام پر آرہی ہے جس میں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی اچھی خاصی تاریخ آگئی ہے اور جس میں سرسید، سید محمود، شبلی، بیک، ماریسن، مولانا شوکت علی، نواب وقار الملک، آفتاب احمد خاں کے متعلق بہت قابل قدر، دلچسپ اور معنی خیز اشارے ملتے ہیں۔ خود میر صاحب کی زندگی بڑے مشکل حالات میں تعلیم حاصل کرنے اور اس تعلیم اور صلاحیت کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دینے کی ایسی مثال ہے جو ہماری قوم میں کم نظر آتی ہیں۔ سرسید کی کیمیا اثر نگاہ نے میر صاحب میں بھی خدمت ایثار اور پیہم خاموش محنت کا جو جذبہ بیدار کر دیا تھا اس نے ان کی پوری زندگی کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیا۔ اس میں نہ عہدے کی آرزو تھی نہ دولت کا لالچ نہ نام و نمود کی خواہش۔ اس میں محفل آرائی یا دربار داری کے ذریعہ اپنی انا کو تسکین دینے کی گنجائش بھی نہ تھی، یہ زندگی دوستوں کے ہجوم میں گھرے رہنے یا کالج یا یونیورسٹی کی ایک سیاست میں پنجہ کشی کی زندگی بھی نہ تھی۔ یہ کام کی زندگی تھی، محبت اور خدمت کی زندگی تھی۔ شرافت اور عبادت کی زندگی تھی۔ اصول پرستی اور کردار کی پختگی کی زندگی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانچہ ٹوٹ گیا یہ پانی ملتان بہ گیا۔

میر صاحب غالباً شروع ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے، بڑے مشکل حالات میں تعلیم حاصل کی ۱۸۸۱ء میں انٹرنس پاس کیا اور جنوری ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ آگئے ۱۸۸۶ء میں بی اے کیا اور اسی سال جولائی سے اسکول میں فقہ ماسٹر ہو گئے انہوں نے اسکول میں اس محنت اور جانفشانی سے پڑھایا کہ سرسید نے ان کے کام کی خاص طور پر تعریف کی۔ یہ جب تعطیل کے زمانے میں طلبا کو روک کر انہیں انٹرنس کے امتحان کے لیے تیار کرتے تھے تو اس کا معاوضہ کبھی نہیں لیتے تھے۔ ڈائننگ ہال میں کھانے کے انتظامات کی دیکھ بھال کرتے تھے تو اعزازی طور پر۔ انہوں نے سرسید کی بلند حوصلگی بھی دیکھی اور ان کی آمریت بھی۔ بیک اور ماریسن کا زمانہ بھی دیکھا اور آرچ بولڈ اور ٹول کا دور بھی۔ سید محمود کے مخصوص مزاجی کیفیت کو بھی جھیلا اور محسن الملک اور وقار الملک کے زمانے کے معرکوں سے بھی سلامت روی

سے گزرے۔ نہ کسی پارٹی کے ممبر ہوئے نہ کسی پارٹی کی مخالفت کی خدمت سے مخدوم بنے۔
ایرانی طلبا کو علی گڑھ لانے کے لیے ایران کا سفر کیا مگر اپنے پیسے سے جنوری ۱۹۲۰ء تک کالج سے متعلق رہے۔ اس کے بعد استعفا دے کر اپنے وطن ریواڑی چلے گئے مگر ۱۹۲۱ء میں انہیں نواب صدر یار جنگ نے پھر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر کا نگراں مقرر کیا اور وہ ۱۹۳۵ء تک یہ کام کرتے رہے۔ ڈپٹی حبیب اللہ سے ایسی دوستی تھی کہ انہوں نے اپنے مکان کا نام ولایت منزل رکھا۔ میر صاحب نے اپنے مکان کا نام حبیب اللہ منزل رکھا۔ جب تک اس قابل رہے روزان سے ملنے جاتے تھے آخر ۸ر جولائی ۱۹۴۹ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ آپ بیتی دراصل کوئی مربوط داستان نہیں ہے۔ انہوں نے جو نوٹ آخر زمانے میں منشی نجم الدین کو لکھوائے تھے ان کو سید محمد ٹونکی صاحب نے ضروری اضافوں کے ساتھ شائع کر دیا ہے اور ان کے جو مضامین مل سکے وہ بھی شامل کر دیے ہیں۔ کتاب کی زبان سادہ اور بقول ٹونکی صاحب 'کھری' ہے مگر لکھنے والے کے خلوص، واقعات کی اہمیت، بے لاگ نظر نے اس میں بڑی جان پیدا کر دی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں ان کا سبو مٹی کا ہے مگر اس میں شمشیر کی سی تیزی ہے۔

سر سید کے آخری زمانے، سید محمود کے تلون اور کالج کی مشکلات کا تذکرہ بڑا عبرت انگیز ہے شبلی سید محمود کے بڑے حامی تھے۔ ٹرسٹی بل کے ہنگامے میں بھی انہوں نے سید محمود کا ساتھ دیا تھا سید محمود گھنٹوں گپ لڑانے کے سائق تھے شبلی کے پاس کئی دفعہ صبح کو گئے یہ وقت ان کے لکھنے پڑھنے کا ہوتا تھا۔ آخر شبلی نے یہ بات سید محمود پر ظاہر کر دی۔ سید محمود کو ناگوار گزرا اور دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ سر سید کے ساتھ آخر زمانے میں سید محمود نے جو سلوک کیا اور جس طرح انہیں پہلے بورڈنگ ہاؤس میں اور پھر حاجی اسمٰعیل خاں کے یہاں منتقل ہونا پڑا اس کا تذکرہ میر صاحب نے بے کم و کاست کر دیا ہے۔ مولانا شوکت علی نے جس طرح طالب علمی کے زمانے میں کرکٹ کی گیندوں کے نام پر وہائٹ وے لیڈلا کلکتہ سے ذاتی ضرورت کی چیزیں منگائیں اور اس پر ان کو میر صاحب نے فہمائش کی اس کا بھی حال درج ہے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ کالج میگزین ۱۸۹۱ء میں

جاری ہوا۔ اولاً علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوتا رہا اس کے بعد علیٰحدہ چھپنے لگا جب مارلیسن پرنسپل ہوئے تو انہوں نے کالج میگزن پر بورڈنگ ہاؤس کے روپیہ کا قرض دیکھ کر اسے بند کرنا چاہا، مگر پھر یہ طے ہوا کہ مارلیسن، ٹینگ، ولایت حسین، عبدالقادر اور سجاد حیدر کے پرائیوٹ پرچے کی حیثیت سے شائع ہو۔ یہ بھی بڑی عبرتناک بات ہے کہ سرسید کی تجہیز و تکفین کے وقت یہ سوال تھا کہ اخراجات کون پورا کرے گا میر صاحب چندہ کرنے پر آمادہ تھے۔ بالآخر محسن الملک نے پچاس روپیے یہ کہہ کر دیے کہ "یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کب چندہ مانگنے آویں گے"۔ شبلی کے علی گڑھ سے جانے کی بھی اصلی وجہ میر صاحب نے بیان کی ہے۔ شبلی حاجی اسمٰعیل خان کی کوٹھی میں رہتے تھے اور حاجی اسمٰعیل خاں کو سید محمود کے خلاف آمادہ کرتے تھے اس لیے بیک نے شبلی سے کہا آپ نے گرمی اور برسات میں علی گڑھ سے باہر رہنے کی اجازت حاصل کر لی تھی اب کیوں نہیں تشریف لے جاتے۔ چنانچہ شبلی علی گڑھ سے چلے گئے۔

غرض پوری کتاب میں ایسی ہی اہم معلومات بکھری پڑی ہیں۔ علی گڑھ تحریک، ایم اے او کالج کی تاریخ اور اس دور کی اہم شخصیتوں پر جو بھی تحقیق ہوگی اس میں میر صاحب کی اس چھوٹی سی آپ بیتی سے بہت مدد ملے گی اور جو بھی اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس سادہ اور پرکار شخصیت، اس کردار کے غازی اس ایثار کے پتلے اور اس شرافت اور اخلاق کی تصویر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا علی گڑھ کو جو عظمت حاصل ہوئی وہ سرسید اور ان کے میر صاحب جیسے رفیقوں کے خلوص اور خدمت کی وجہ سے حاصل ہوئی اور جب تک ہم ان بزرگوں کی اس خصوصیت کو پھر سے زندہ نہیں کریں گے ان کی جانشینی کا حق ادا کرنے میں ناکام رہیں گے ان کے خیالات کی تقلید اتنی ضروری نہیں ان کے خلوص اور کردار کو اپنانا زیادہ ضروری ہے۔

اقبال اور ہم

اقبال کے انتقال کے انتیس سال بعد آج یہ بات خاصی ذمہ داری سے کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کی قدر تو بہت ہوئی مگر ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔ اس انصاف کی ضرورت جتنی آج ہے اتنی کبھی نہ تھی۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اقبال کی اہمیت کو نظر انداز کیا گیا اور پاکستان میں ان کو ایک سیاسی رہ نما مان لیا گیا اور ان کی شاعری کو بھی عموماً اسی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا اقبال کے سلسلے میں یہ باتیں بنیادی اہمیت نہیں رکھتیں کہ فلسفے میں ان کا کیا مقام ہے سیاست میں ان کا کیا کارنامہ ہے یا مسلمانوں کے لیے انہوں نے کیا کیا ہے اور غیر مسلموں کے لیے کیا نہیں کیا۔ بنیادی اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں اور ان کی شاعری میں عظمت اور آفاقیت دونوں ہیں۔ کبھی کبھار شاعر خود اپنے کلام کا بہترین نباض نہیں ہوتا۔ اقبال نے جب یہ کہا کہ لوگ مجھ سے آب و رنگ شاعری کا مطالبہ کرتے ہیں میں انہیں شکوہِ خسروی دیتا ہوں اور تختِ کسریٰ ان کے قدموں میں ڈال دیتا ہوں، تو اقبال نے اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا۔ شاعری اپنی قیمت آپ ہے۔ اگر وہ شکوہ خسروی دیتی ہے یا نہیں دیتی تو اس سے اس کی خوبی یا خامی نہیں دیکھی جاتی، مگر اقبال نے جب آنکھ کھولی تو سرسید کی تحریک کے اثر سے ہندوستان میں مقصدیت کی ایک لہر بلند ہو چکی تھی۔ اقبال، سرسید اور حالی کے اثرات سے کیسے آزاد ہو سکتے تھے، چنانچہ ان کی شاعری میں بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر اس کی تیسری دہائی تک کے تمام مشرقی اور

مغربی افکار و اقدار اور تحریکات و میلانات ملتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اقبال کے یہاں وقتی اور ہنگامی پہلو بھی ہیں مگر ان کی عظمت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کی مخصوص نظر سے کام لے کر ان وقتی اثرات کو بھی ایک آفاقی اور عالمی پس منظر میں دیکھا ہے۔ پھر ان کا فن ان کی فکر کے سارے پہلوؤں کی عکاسی کر سکتا ہے اور اس فکر میں ایک ایسی گرمی ہے جو خلوص اور پختہ عقیدے سے پیدا ہوئی ہے یعنی اقبال کے الفاظ میں خون جگر نے فن کو معجزہ بنا دیا ہے۔

اقبال نے مشرق و مغرب دونوں کے فلسفیوں اور صوفیوں سے فیض اٹھایا ہے، مگر یہ بھی ان کی بڑائی نہیں ہے بلکہ بڑائی یہ ہے کہ ان کی شاعری میں فلسفہ جدید بن کر آتا ہے۔ قاموسی نہیں معلوم ہوتا اقبال اردو شاعری کی ساری روایت کا امین ہے اور اس کے ساتھ مغربی ادب کے معیاروں سے بھی آشنا ہے۔ وہ لفظ کے مزاج کو جانتا ہے، اس نے فارم پر فتح حاصل کی ہے، وہ جوش یا بعض دوسرے شعراء کی طرح الفاظ کے انبار لگانے کا قائل نہیں ہے۔ ہر لفظ بے مثل فن کاری ظاہر کرتا ہے اور اپنا پورا جادو جگاتا ہے، بلاشبہ بال جبریل اس کا شاہ کار ہے اور مسجد قرطبہ، ساقی نامہ اور لینن اس کی بہترین نظمیں، مگر بانگ درا کے گہرے مطالعہ کے بغیر بال جبریل کی عظمت واضح نہیں ہو سکتی۔

اقبال ایک باشعور فن کار ہے اسے اپنے جگر پاروں کی قربانی کرنی بھی آتی ہے۔ چنانچہ بانگ درا میں بہت سی نظموں کی آخری شکل اور ان نظموں کی ابتدائی صورت میں بڑا فرق ہے۔ اقبال سے صحیح معنی میں اردو شاعری میں نظم کا سلیقہ آتا ہے اور اقبال نے بھی خاصی محنت سے یہ فن سیکھا ہے مگر اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے نظم پر زور دینے کے باوجود غزل کو نہیں چھوڑا اور اسے بھی بدل کر رکھ دیا بال جبریل میں حکیمانہ شاعری کے بعد اس نے حکیمانہ نکتہ سنجی کا ایک اور آرٹ ضرب کلیم کے ذریعہ سے پیش کیا۔ اس نے اردو شاعری کی رگوں میں تازہ خون دوڑایا۔ اس کے ذریعہ سے آدم کو آداب خداوندی سکھائے اور مغرب کی مدد سے نئی مشرقیت بخشی وہ اردو کا بہت بڑا شاعر ہے اور میر، غالب، نظیر انہیں کی صف میں ہے۔

مگر آج اقبال کی شاعری کی تقلید نہ ممکن ہے نہ مناسب، زندگی بہت آگے بڑھ

گئی ہے، اقبال کا فکر وفن ہمارے لیے آج بھی بڑی مسرت اور بصیرت رکھتا ہے مگر اس دور کے درد و داغ اور سوز و ساز کو شعر میں ڈھالنے کے لیے، اقبال کا فن ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ ہمیں اس کے لیے اور سادہ اور دھرتی سے قریب اور بول چال کے مطابق اور کنایاتی اور طنزیہ ہونا پڑے گا اور خاصی بے باک حقیقت نگاری کی ضرورت ہوگی خطابت یا حکمت دونوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ کبھی سرگوشی کے انداز میں باتیں کرنی ہوں گی، کبھی خود کلامی کے لہجے میں، کبھی اپنے آپ سے کچھ سوال کرنے ہوں گے کبھی دو یا تین لہجوں کا یکجا کرنا ہوگا آدم کو آداب خداوندی سکھانے سے پہلے آدم کا اپنے آپ کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس دور میں سب سے اہم کام اس آدمی کی تلاش ہے جس کے پیچھے پانچ ہزار سال کی تہذیب کی تاریخ اور اس سے پہلے کے جانور کی لمبی کہانی ہے، اس کام میں میر، نظیر، غالب، اقبال سبھی سے ہمیں مدد ملے گی اور ان سب کی مدد سے اردو شاعری کا نیا لہجہ اور نیا آہنگ متعین ہوگا۔ اقبال اپنی زندگی ہی میں کلاسیک عظمت کے حامل ہو چکے تھے اور کسی کلاسیک سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ مگر کلاسیک کا پیرتسمہ پا نہیں ہونا چاہیے وہ ہمیں فکر وفن کے چراغ دیتا ہے جس کی مدد سے ہم اپنے چراغ روشن کر سکتے ہیں۔

غالبؔ اردو اور ہندوستان

غالب کی سو سالہ برسی جس بڑے پیمانے پر ہمارے ملک میں منائی گئی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب سے اور غالب کی شاعری سے اور غالب کی زبان سے ملک میں کتنی گہری دلچسپی موجود ہے۔ سرکاری ذرائع سے اور بڑے سرمایہ داروں کی مدد سے روپیہ تو جمع کیا جا سکتا ہے، مگر اتنی تقریبات نہیں ہو سکتیں، اتنی کتابیں شائع نہیں ہو سکتیں، اتنے رسالوں کے خاص نمبر نہیں نکل سکتے، اخباروں میں اتنے مضامین نہیں لکھے جا سکتے، اتنی بڑی تعداد میں لوگ جلسوں میں اور دوسرے پروگراموں میں شرکت نہیں کر سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ اس دلچسپی، محبت اور عقیدت سے کچھ عملی کام بھی لیا جا سکے گا۔ ایک طرف ہمیں غالب کی شخصیت، شاعری اور نثر کا گہرا مطالعہ کر کے، جدید ذہن کے مطابق اور موجودہ معیار تنقید کے لحاظ سے غالب کو پرکھنا ہوگا۔ دوسرے اردو ادب کی ترقی کے لیے مناسب راہیں نکالنی ہوں گی، تیسرے غالب کی زبان، اردو کی تعلیم اور اس کے چلن کے لیے تمام ضروری اقدامات کرنے ہوں گے، غالب کی شخصیت ایسی رنگا رنگ، جامع اور توانا شخصیت ہے کہ اس کی کشش عارف و عامی، اردو دوست اور دوسری زبانوں کے جاننے والے (جس حد تک وہ غالب سے واقف ہو سکے ہیں) سبھی محسوس کرتے ہیں۔ دہلی کے بین قومی سیمنار میں کئی مغربی علما نے اعتراف کیا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری ان کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہے اور غالب کے یہاں انہیں ایک اپنائیت اور یگانگت سی محسوس ہوتی ہے۔ غالب کی شاعری کی معنویت کا احساس اب ہمارے ادبی حلقوں میں اور گہرا ہو رہا ہے اور ان کے ابتدائی کلام کی اہمیت بھی اور

بڑھ گئی ہے کیونکہ اسے محض غالب کی مشکل پسندی یا بے راہ روی کہہ کر ٹالا نہیں جاسکتا، بلکہ اس میں ان کی عظمت کے وہ سارے نقوش نظر آتے ہیں جن سے آگے چل کر غالب کا نگار خانہ تعمیر ہوا۔ یہ بات بھی اب واضح ہوتی جارہی ہے کہ ادب میں عظمت کسی خاص نظریے یا فلسفے یا مسلک سے نہیں آتی بلکہ تخیل کی رنگارنگی، اور تخلیقی صلاحیت، تجربے کی گہرائی اور صداقت اور اس تجربے کی پیچیدگی اور تہ داری سے آتی ہے۔ یہ بات بھی اب تسلیم کی جانے لگی ہے کہ جس طرح کسی نظریے سے وابستگی ادب میں کوئی جرم نہیں ہے اسی طرح نا بستگی بھی کوئی جرم نہیں ہے بلکہ شاعری 'چاہیئے' سے زیادہ 'ہے' اور ہدایت کرنے سے زیادہ احساس اور عرفان کی دولت عطا کرنے سے عبارت ہے۔

اب وقت ہے کہ غالب کی زبان کی بقا اور ترقی کے لیے اور مستعدی سے کوشش ہو۔ یہ کام سب سے پہلے اردو دوستوں اور غالب کے چاہنے والوں کی توجہ چاہتا ہے۔ انہوں نے ابھی تک اپنی زبان کے لیے وہ کوشش نہیں کی جس کی یہ زبان مستحق ہے۔ انہوں نے حکومت یا اکثریت سے اپیل کرنے یا قرار دادیں پاس کرنے یا اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کو کافی سمجھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ منظم ہو کر اپنے بچوں کی اردو میں تعلیم کے لیے کمر بستہ ہوں جہاں حکومت سے کہہ کر ابتدائی تعلیم کا انتظام ہو جائے وہاں یہ انتظام کرائیں جہاں یہ نہ ہو سکے تو اپنے بچوں کو کسی دوسری زبان کے ذریعہ سے تعلیم دلوانے کے بجائے خود ایسے اسکول کھولیں جن میں اردو کے ذریعہ تعلیم کا مناسب انتظام ہو۔ پھر انہیں اس پر اصرار کرنا چاہیے کہ مڈل اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے کا نفاذ اس طرح ہو کہ مادری زبان کی تعلیم کا لازمی انتظام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حقوق کی بنا پر جو جمہوریت اور دستور نے ہمیں دیے ہیں ہم ریاستی حکومتوں اور مرکز کو اس وقت تک برابر توجہ دلاتے رہیں گے اور ان پر ہر قسم کا جائز دباؤ ڈالتے رہیں گے .....

جب تک ہمارے مطالبے پورے نہ ہو جائیں مگر اوّل تو بنیادی فرض ہمارا ہے دوسرے جو سہولتیں حکومت کی طرف سے ملیں گی، ان پر عمل بھی ہمیں ہی کرانا ہوگا۔ اردو کی تعلیم کے لیے ہر طرح کی سہولتوں کے علاوہ ابھی ہمیں دفتروں، عدالتوں، مجالس قانون ساز

اور شہری اداروں میں اردو کے استعمال کے لیے بھی سہولتیں حاصل کرنا ہیں۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مرکزی پارلیمنٹ میں تو ممبر اپنی مادری زبان میں حلف وفاداری لے سکتے ہیں لیکن کچھ ریاستی مجالس قانون ساز میں اس کی اجازت نہیں ملتی۔ حال میں اتر پردیش کی مجلسِ قانون ساز میں اس کی اجازت نہیں ملی۔ اب پارلیمنٹ میں اعلان ہوا ہے کہ اس قسم کی اجازت دینے کے لیے قوانین میں ضروری ترمیم کی جائے۔ یہ ترمیم جلد سے جلد ہونی چاہیے کیونکہ اس قسم کی پابندی دستور کی ہدایات اور اس کی روح دونوں کے خلاف ہے۔ اردو زبان وادب کی ترقی کے راستے سے ہر رکاوٹ جلد سے جلد دور ہونی چاہیے مگر اس کے لیے اردو دوستوں کو نہایت مستقل مزاجی سے رائے عامہ ہموار کرنی پڑے گی اور خود عملی اور مثبت اقدامات کرنے ہوں گے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی خدمات

افلاطون کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس کی شخصیت کے نظری اور عملی پہلو دونوں آکر جمالیاتی کمال میں مل گئے ہیں مصلح اور مفکر کا تضاد آرٹسٹ کی ذات میں گم ہو گیا ہے۔ یہ بات افلاطون کی شہرۂ آفاق کتاب "ریاست" کے اردو مترجم ڈاکٹر ذاکر حسین پر صادق آتی ہے۔

افلاطون سے لے کر برٹرینڈرسل تک مفکرین و مصنفین کے یہاں یا تو علم کی گہرائی ہے یا ایک پیمبرانہ شان، یا حسن بیان کی چاشنی، یہ تینوں خصوصیات علیحدہ علیحدہ بھی اتنی ہی اہم ہیں کہ مشکل سے ایک ذات میں جمع ہو سکتی ہیں۔ افلاطون کو ان سب کا بھرپور حصہ ملا تھا۔ ذاکر حسین کے یہاں بھی تینوں کے ایک لطیف امتزاج نے جلال و جمال کی ایک دھوپ چھاؤں پیدا کر دی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں ایک مفکر کی تابانی فکر، ایک معلم کی شفقت و مرحمت، ایک عاشق کا سوز و گداز، ایک مدبر کا وزن و وقار، ایک صوفی کی درویشانہ شان اور ایک مہاتما کی سی معصومیت، سب کا جلوہ نظر آتا ہے۔ علوم میں ان کی نظر ہمہ گیر اور ان کی معلومات ہمہ رنگ ہیں، فلسفہ، اقتصادیات، ادب، سائنس، تعلیم، تصوف، مذہبیات، ہر موضوع پر ان کا مطالعہ گہرا اور ان کا علم حاضر ہے۔ ان کے یہاں علم صرف معلومات کا خزانہ ہی نہیں انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی خدمت کا وسیلہ بھی ہے۔ وہ اگر صرف مصنف یا معلم ہوتے تو بھی ان کا درجہ بہت بڑا ہوتا مگر ان کی سیمابی فطرت نے کبھی تصنیف و تالیف کے گوشۂ عافیت پر قناعت نہیں کی، انہوں نے جوش جنوں میں بار بار گھر چھوڑ کر جنگل کی راہ لی

اور اپنے خون دل سے کتنے ہی ویرانوں میں علم و عمل کے پھول کھلائے۔ انہوں نے کتابوں میں کبھی اپنے آپ کو بند نہیں کیا مگر جب کبھی کچھ لکھا تو اپنے اخلاص، دلسوزی، اور سماجی شعور کی وجہ سے الفاظ میں وہ پسی ہوئی بجلیاں بھر دیں جن کی وجہ سے ادب میں آب و تاب آتی ہے اور جن سے انسانوں کی زندگی بدلتی، سنورتی اور نکھرتی ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے خواب دیکھے مگر خوابوں کی لطافت اور رنگینی میں کھو جانے کے بجائے حقیقت کی سنگلاخ وادیوں میں یقین محکم اور عمل پیہم کے رنگ محل بنائے۔ انہوں نے اپنی بے نظیر تحقیقی صلاحیتوں سے بہت سے کام لیے کتابیں لکھیں، خطبے تیار کیے، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑا، بکھرے ہوئے افراد کو بلند مقاصد کا آئینہ دے کر انہیں سماجی طاقت عطا کی۔ شخصیتوں میں کردار کی عظمت پیدا کی۔ اداسی میں امید کی جھلک دکھلائی، راکھ میں شرر پیدا کیے۔ بنجر زمینوں میں پھول کھلائے۔ ذہنی توانائی کا یہ جوالا صرف کتابوں میں اپنے آپ کو کیسے بند کر سکتا تھا ہاں شاید ان کی تصانیف کی خوبی کا راز یہی ہے کہ بقول مجیب: "قدرتی استعداد نے زبان کو اپنا خادم بنا کر ان میں خوبیاں پیدا کر دی ہیں جو ادیبوں کی برسوں کی مشق اور محنت کے بعد نصیب ہوتی ہیں۔"

ذاکر صاحب کی پہلی قابل ذکر کتاب افلاطون کی "ریاست" کا اردو ترجمہ ہے اس کے متعلق مولانا اقبال احمد سہیل جیسے صاحب نظر کی یہ رائے قابل غور ہے کہ "افلاطون کو اردو آتی ہوتی تو وہ بھی یہی زبان اختیار کرتا۔" کتاب کا مقدمہ واقعی دریا کو کوزے میں بند کرنے کا ایک نادر نمونہ ہے افلاطون کی تعلیم کے تمام اہم پہلوؤں سے ذاکر صاحب نے اردو دنیا کا تعارف ایسی پرمغز جان دار اور شگفتہ نثر میں کرایا ہے کہ پڑھ کر انسان وجد کرنے لگتا ہے۔ خود ترجمہ نہایت شستہ، رواں، سہل اور سلیس ہے۔ افلاطون کے نزدیک انسان محض انفرادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اپنی صلاحیتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے ریاست کی رکنیت، کا محتاج ہوتا ہے۔ اس لیے کتاب میں اچھے انسان کی تلاش خود بخود اچھی ریاست کی تشکیل کے لیے ایک رمز بن گئی ہے اور فلسفہ، سیاست، ادب، تاریخ سب کا ایک دفتر۔ یہیں سے ذاکر صاحب کی طبیعت کا مخصوص رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ علم ان کے یہاں

ہنرمندی کا ایک ذریعہ نہیں انسانیت کی خدمت کا ایک وسیلہ ہے، اور کتابیں بکھری ہوئی معلومات کا ایک انبار نہیں انسانیت کی آرائش جمال کے لیے آئینہ بن جاتی ہیں۔

جرمنی میں ذاکر صاحب مشہور معلم معاشیات پروفیسر زومبارٹ کے شاگرد تھے۔ اگر وہ اس علم پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرتے تو ہندوستان میں اس وادی کے امام ہوتے۔ استاد نے شاگرد کو ایک افہامی طریقۂ فکر دیا جس کی مدد سے شاگرد نے اردو میں معاشیات کے مسائل کو علمی مگر شگفتہ انداز میں بیان کیا۔ معاشیات مقصد اور منہاج کہنے کو ایک چھوٹی سی کتاب ہے مگر اس میں معیاری، ترتیبی، اور افہامی معاشیات کے تمام بنیادی اصول نہایت دلنشیں اسلوب میں بیان کر دیے گئے ہیں ذاکر صاحب نے معاشیات پر بعض مغربی مفکرین کے خیالات کا ترجمہ بھی کیا ہے مگر اس کتاب کی اہمیت پھر بھی بہت ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ علمی مسائل کو صرف گمبھیر اور ادق الفاظ میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے ان کے لیے یہ ایک مستقل سبق ہے اعلیٰ سے اعلیٰ موضوع عام فہم انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے لکھنے والا چاہیے۔

ذاکر صاحب نے ترک موالات کے زمانے میں علی گڑھ چھوڑ کر جامعہ بسائی۔ جب یورپ سے واپس آئے، تو جامعہ والے کس مپرسی کے شکار تھے۔ جامعہ کے قائدین سیاست کی وادیوں میں بھٹک رہے تھے اور قومی تعلیم کا یہ تجربہ دم توڑ رہا تھا۔ ذاکر صاحب نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اس شوق فضول کو جراءت رندانہ اور جراءت رندانہ کو عین ہوشمندی بنایا۔ قومی اور علمی بنیادوں پر تعلیم کا راستہ ہموار کیا۔ اساتذہ کی ایک جماعت تیار کی طلبا میں علم کی پیاس، اخلاق کی لگن اور خدمت کی خلش بیدار کی اور ستاروں کے آگے دیکھنے والی نگاہ کو ایک تعلیمی بستی کی تعمیر کے مشکل لیکن مقدس کام میں لگا دیا۔ اس تجربے، بصیرت، علم اور عرفان کا ثمرہ اردو میں وہ کتاب ہے جو تعلیمی خطبات کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں جا بجا ایسے بلیغ اور فکر انگیز اشارے ہیں جو مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں۔ چونکہ یہ خطبے مختلف اوقات میں لکھے گئے اس لیے کہیں کہیں ان میں خیالات ہی نہیں الفاظ کی تکرار بھی ہے، جا بجا خطابت بھی اپنا زور دکھاتی ہے۔ مگر قومی تعلیم، مسلمانوں کی تعلیم پر ذاکر صاحب نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے ان کی اصابت رائے، بالغ نظری، حب الوطنی،

سماجی شعور، نفسیاتی ژرف بینی، سب کا حیرت انگیز ثبوت ملتا ہے۔ وہ علم اور ہنر میں فرق کرتے ہیں۔ "جو اپنی غرض کا کام کرتا ہے وہ ہنرمند ضرور ہوتا ہے مگر تعلیم یافتہ نہیں ہوتا۔ جو قدروں کی خدمت کرتا ہے وہ تعلیم پا جاتا ہے۔ قدر کی سیوا میں آدمی کا حق ادا کرتا ہے اپنا مزا نہیں ڈھونڈتا۔" مادّی وسائل کی اہمیت کو وہ مانتے ہیں مگر وہ انہیں سب کچھ نہیں سمجھتے۔ "کون انکار کر سکتا ہے کہ روٹی کمانا زندگی کے اہم ترین کاموں میں سے نہیں ہے لیکن اس فرض کو پورا کرنے میں آدمی پر اپنی شخصیت، انفرادیت اور آدمیت کا احترام بھی لازم ہے۔" وہ تعلیم کے کام کو ایک مقدس کام سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بھی ایک عبادت سے کم نہیں فرد کو ان خوبیوں سے آشنا کرنا ان کے نزدیک انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے اسی وجہ سے وہ تعلیم کو بعض اوقات سیاست سے بھی بلند درجہ دے دیتے ہیں۔ غالباً سیاست سے یہاں ان کی مراد وہ سستی سیاست ہے جو جلسوں اور جلوسوں کے چکر، انتخاب اور حکومت کے نشے سے عبارت ہے۔ ورنہ حقیقی سیاست میں تو تعلیم ایک بنیادی پتھر کا کام دیتی ہے۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انہوں نے ارباب سیاست کو مخاطب کر کے جس درد اور دکھ کے ساتھ تعلیمی کام کرنے والوں کی دشواریوں کا ذکر کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلط سیاست کا دھارا تعلیم کے خاموش اور دیرطلب کام میں کیا کیا دشواریاں پیدا کر سکتا ہے، اور اس تعمیری کام کو کس قدر صبر آزما بنا سکتا ہے ذاکر صاحب نے ان خطبات میں استاد کا جو نصب العین پیش کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے کیونکہ اس سے ان کے خیالات کی اہمیت اور اسلوب کی دل کشی دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ "استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا محبت کا عنوان ہوتا ہے اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے سماج سے محبت ہوتی ہے۔ اچھے استاد استاد کی جذباتی زندگی میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی اور پائداری بھی اس کی روح میں حق و صداقت، حسن و جمال، نیکی اور تقدس، انصاف اور آزادی کے مظاہر کی گرمی ہوتی ہے جس سے وہ دوسرے دلوں کو گرماتا ہے اور جس میں تپا تپا کر اپنے شاگردوں کی سیرت کو نکھارتا ہے۔ استاد میں اہل قوت اور حکمرانوں کی سیرت کا ایک ذرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں اور ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ حکمراں جبر کرتے ہیں اور یہ صبر کرتا ہے۔

وہ مجبور کر کے ایک راہ پر چلاتے ہیں یہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتا ہے ایک کے وسائل ہیں تشدد اور زبردستی، دوسرے کے محبت اور خدمت، ایک کا کہنا ڈر سے مانا جاتا ہے، دوسرے کا شوق سے، ایک حکم دیتا ہے دوسرا مشورہ، وہ غلام بناتا ہے یہ ساتھی، جب ساری دنیا مایوس ہو جاتی ہے تو بس دو آدمی ہیں جن کے سینے میں امید باقی رہتی ہے۔ ایک ماں دوسرے اچھا استاد۔"

برناڈ شا نے کہا ہے کہ "جوش بیان اسلوب کا ابجد اور تمت ہے۔" اوپر کے اقتباسات میں خلوص، علم، اعتماد اور عرفان نے الفاظ کو آتش نفسی کا گر سکھا دیا، عام زبان سادہ ہے مگر جا بجا دلکش ترکیبیں، مرصع فقرے دل میں اتر جاتے ہیں اور رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ جذبات کا طوفان موجزن ہے مگر اظہار پر مکمل قابو ہے خیالات کی بازیگری نہیں ہے، علم کی نمائش نہیں ہے فکر انگیز خیالات اس طرح جھلکتے ہیں جیسے مینا سے آتش سیال ابل جائے۔ طرزِ بیان پتیرا نہیں ہے، طلسم سازی نہیں ہے۔ شخصیت کے جلدۂ صد رنگ کی آب و تاب ہے اس میں مفکر کی پیشانی کا جمال، فنکار کے خون جگر کی شوخی اور ایک فرشتہ صفت انسان کی دردمندی اور دلسوزی کی گرمی اور حلاوت ہے۔ یہ طرز بیان ایک حسینہ کی بے ساختہ ادائے دلبری ہے یا ایک مجاہد کی بے جھجک تیغ آبدار، اس میں آمد ہی آمد ہے آورد کا کوسوں پتہ نہیں۔

ذاکر صاحب کے بہت سے مضامین رسالہ جامعہ کے اوراق میں دفن ہو گیے۔ کاش انہیں کوئی یک جا کر دیتا۔ رفتار زمانہ پر ان کے مضامین خصوصاً بیرون ملک کی سیاست پر ان کے تبصرے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعہ کی جوبلی کے موقع پر انہوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ بھی ان کے اسلوب کا ایک دلکش نمونہ ہے اور جامعہ کے کارناموں پر ایک روشن تبصرہ۔ سر سیّد، نیا علی گڑھ، حالی محب وطن کی حیثیت سے، گاندھی جی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کے متعلق ان کے تاثرات، ہندوستان کیا ہے؟ غرض ہماری گزشتہ پچیس سال کی ذہنی، سیاسی، تہذیبی، تعلیمی اور ادبی زندگی کے ہر اہم موڑ اور فیصلہ کن لمحے پر ان کے قلم سے تبصرے ہیں ان کو یکجا کر کے شائع کیا جائے تو ذاکر صاحب کا ادبی سرمایہ جو اپنے موضوعات کے تنوع، اپنے افکار کی گہرائی اور اپنے اسلوب کی برگزیدگی کی وجہ سے بڑے سے بڑے ادیبوں سے کم نہیں ہے، اور بھی بڑا نظر آئے گا۔ زندگی کے اس مجاہد کو قلم

ہاتھ میں لے کر یکسوئی سے اپنے افکار کو کاغذ کی نذر کرنے کی مہلت کب ملی جو کچھ لکھا ہے سخت مصروفیت کے زمانے میں، مجبور ہو کر، راتیں آنکھوں میں کاٹ کر، صحت کی خرابی مول لے کر، مگر اس رواداری میں بھی ہر نقش خون جگر سے بنایا ہے اور اسی لیے اس کی آب و تاب ہمیشہ قائم رہے گی۔

ذاکر صاحب بہت کچھ ہیں مگر سب سے پہلے وہ معلم ہیں، انہیں نوجوانوں سے اور بچوں سے بڑی محبت ہے۔ میں بچوں سے محبت کو بڑائی کی ایک علامت سمجھتا ہوں! انہوں نے نہ صرف بچوں کو انسانیت کے آداب سکھائے ہیں بلکہ ان کے لیے کہانیاں، ڈرامے، مضامین سب کچھ لکھے ہیں۔ "پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی" "مرغی جو اجمیر چلی" "تھاب" "ابو خاں کی بکری" جوان بوڑھے سبھی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ بچوں کے لئے یہ سیدھی، سادہ، دلچسپ کہانیاں ہیں، جوانوں، اور بوڑھوں کے لیے ان میں آزادی، حب وطن، انسانیت تہذیب پر رمز و ایما کی ایک سحر کاری ہے سولیفٹ نے گلیور کے سفر کی جو داستان لکھی تھی بچے اسے تفریح کی کان سمجھتے ہیں حالانکہ سولیفٹ نے قصے کہانی کے پردے میں انسان کی فطرت پر ایسے ایسے نشتر لگائے ہیں کہ سمجھنے والا تلملا کر رہ جائے۔ ذاکر صاحب طنز نگار نہیں ہیں، طنز نگار کی بے تعلقی ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے یہاں ایک معلم کی مرحمت و شفقت ہے، وہ انسانوں سے نہ مایوس ہوتے ہیں نہ بیزار۔ کہا جاتا ہے کہ خدا انسانوں سے ابھی تک بیزار نہیں ہوا ہے۔ خدا کی یہ صفت خدا کے اس نیک بندے کی شخصیت میں جھلکتی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "اس میں بڑا مزا ہے کہ آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے روز فریب کھائے ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقلمندوں کو اور بیوقوفوں کو کہ دونوں گمراہ ہوتے ہیں معاف کرے" یہ جان کر کہ فریب کھاتے میں جو مزہ ہے وہ بڑی سے بڑی عقلمندی میں بھی نہیں۔

ذاکر صاحب نے جامعہ میں اردو اکیڈمی کی بنیاد ڈالی۔ انہیں کی رہنمائی میں جامعہ نے اردو میں اعلیٰ تعلیم کا تجربہ کیا۔ انہوں نے ہی طالب علمی کے زمانے میں جرمنی میں دیوان غالب رباعیات عمر خیام، اور دیوان شیدا کے خوبصورت ایڈیشن ٹائپ میں شوکت کاویانی پریس برلن سے شائع کیے اور بعد میں مکتبہ جامعہ کو سنجیدہ ادب نہایت اہتمام سے دیدہ زیب

انداز میں شائع کرنے کا حوصلہ دیا۔ انہیں کی رہنمائی میں رسالہ جامعہ نے برسوں اردو ادب کی خاموش اور ٹھوس خدمت کی۔ انہوں نے ہی انجمن ترقی اردو ہند کے صدر کی حیثیت سے جدید ہندوستان میں اردو کے منصب اور مقام کو واضح کیا اور علی گڑھ پر اردو کا جو حق ہے وہ علی گڑھ والوں کو یاد دلایا۔ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر سے سچی ہندوستانیت اور سچی انسانیت کا گہرا تعلق واضح کیا۔ انہوں نے ادیبوں اور شاعروں کی ہمت افزائی کی ہے، ادب کی تعلیم کے معنی اور مقصد پر روشنی ڈالی ہے اور ادب کے ذریعہ سے ملک و قوم کی خدمت کو عبادت کا درجہ دیا ہے انہوں نے ادب کو وسعت بھی عطا کی ہے اور گہرائی بھی اور زندگی کی چمک دمک تھرتھراہٹ اور گداز سے بھی آشنا کیا ہے۔ وہ جامعہ اور علی گڑھ میں شدید مصروفیات کے باوجود جدید اور قدیم علوم کے مطالعہ میں برابر منہمک رہے ہیں۔ ان کے دن انتظامی امور اور رات مطالعہ کے لیے وقف تھے، علمی دنیا میں علم کی ایسی پیاس اور علمی شغف میں اتنی عملی کاوشیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں۔ اس معلم، مفکر، مہاتما، صوفی، اور علم و عمل کے پیکر کی ادبی خدمات کہاں تک گنائی جائیں جس پر اقبال کے مردِ بزرگ کے یہ اشعار ہو بہو صادق آتے ہیں۔ ان کی طرف تو اشارہ ہی کیا جا سکتا ہے ؎

پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں
ہے مگر اسکی طبیعت کا تقاضا تخلیق

انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اسکو
شمع محفل کیطرح سب سے جدا سب کا رفیق

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد معانی میں دقیق

اس کا انداز نظر سارے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے واقف نہیں پیران طریق

اُردو کے صاحبِ طرز نثر نگار

(رشید احمد صدیقی)

برناڈ شا نے کہا ہے کہ "بات کا بھرپور ہونا ہی اسٹائل کی ابتدا اور انتہا ہے" جس طرح رزم کا انداز اور ہے بزم کا اور، اسی طرح نثر اور نظم کے اسلوب جدا جدا ہیں۔ نظم میں الفاظ آتش گیر مادّے کی طرح بھک سے اڑ جانے والے ہیں، یا اس سیلاب کی طرح جو سب کچھ بہالے جائے۔ نثر میں بجلی کے اس بٹن کی طرح جو فوراً روشنی کر دے۔ نظم عشق کی ایک جست ہے جو باقاعدہ مارچ کرتی ہے۔ ترتیب سے صفیں قائم رکھتی ہے اور دستور کے مطابق لڑتی یا پسپا ہوتی ہے۔ نظم ہمالیہ کی بلندی ہے جس کی کشش اور عظمت مسلم، لیکن جن پر ہم آپ تو کیا تین سنگھ اور ہلیری بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ نثر اس وادی کی طرح ہے جس میں رہنا، بسنا، خواب دیکھنا اور حقائق کی چکی میں پسنا غرض زندگی کا سارا بیوپار ہوتا ہے۔ نظم تخلیقی اظہار ہے نثر تعمیری اظہار ہے۔

اچھا نثر نگار وہ نہیں ہے جو اپنی سحر بیانی یا خطابت کے جھنڈے گاڑ دے۔ یا الفاظ سے زیادہ اوقاف سے کام لے اچھی نثر کے معنی آئینہ کی طرح روشن اور بھرپور بات کے ہیں۔ اچھے شعر کی طرح اچھی نثر بھی خون جگر سے لکھی جاتی ہے یعنی اس کے لیے خلوص اور ریاض دونوں ضروری ہیں، شخصیت کی آب و تاب نظم و نثر میں مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے ایک میں یہ شعلے کی لپک اور لہو کی دھار ہے دوسرے میں کسی حسینہ کا وہ دلنواز تبسم جو آئینہ رخسار کو جلا عطا کرتا ہے، اردو میں نثر کے حسن کو پہچاننے اور برتنے

والے نظم کے مقابلے میں کم ہیں ہماری نثر کے بانی سرسید، حالی اور شبلی ہیں۔ انہیں کے چراغوں سے موجودہ دور کے نثر نگاروں نے اپنی شمع روشن کی ہے۔

رشید احمد صدیقی کے اسلوب میں علیٰحدہ علیٰحدہ بہت سے اسالیب فکر و فن کی کارفرمائی ملے گی مگر مجموعی طور پر وہ اپنا ایک خاص طرز رکھتے ہیں شخصیت مختلف اثرات و محرکات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مگر اس میں ایک انوکھاپن اور انفرادیت ضرور ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی کی نسل اچھی خاصی رومانی نسل تھی اس نے ادب اور سیاست کو بہت سے خواب دیے۔ اس کے زمانے میں بقول سجاد انصاری "پیرو فا کی خانقاہ سے مجاہدوں کا لشکر برآمد ہو رہا تھا۔ سرسیّد کے ادارے پر شبلی کا اثر ہو چلا تھا، غالب کی عظمت دریافت ہو چکی تھی۔ آسکر وائلڈ اور چیسٹرٹن کی مقبولیت ہندوستان پہنچ گئی تھی۔ رشید صاحب کی طالب علمی کا علی گڑھ، سیاست میں نیازمنداور ادب میں خاصہ دلیر تھا۔ اس تضاد نے اور طالب علمی میں ہی زندگی کے خاصے تجربوں نے ان میں وہ نظر پیدا کی جو خوابوں کی خامی حقائق کی سخت جانی اور جذبات و خیالات کے سیلاب میں کیچڑ دیکھ لیتی ہے ان کی مشرقیت کی بنیاد خاصی مضبوط تھی۔ مغربی خیالات کا طوفان ان کی زندگی کو نہ بدل سکا۔ ہاں انہیں اس طوفان پر ہنسنا اسی مشرقیت نے سکھایا۔ وہ غالب کی رعنائی خیال کے دل دادہ ہو گئے مگر مسلک انہیں اکبر ہی کا عزیز رہا۔ اردو اور فارسی ادب کے گہرے مطالعے نے انہیں رمز و ایما کے ڈھنگ سکھائے اپنے ادارے کی محبت نے انہیں ایک مرکز اور محور دیا۔ انسان دوستی شرافت اور معقولیت کی مروجہ قدروں کے سہارے انہوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اردو نثر بھی ایک اکبر کی منتظر تھی۔ رشید احمد صدیقی نے یہ کمی پوری کرادی۔

اب تک ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ طنزیات و مضحکات اردو میں اس رنگ کا ایک جائزہ ہے، جائزہ نہ تحقیقانہ۔ ہے نہ مکمل مگر اس میں نکتہ سنجی بھی ہے اور شوخی بھی۔ ان کی بلاغت کی وجہ سے یہاں بھی دریا کوزے میں بند ہو گیا ہے ان کے مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے مضامین رشید اور خنداں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ "گنج ہائے گراں مایہ" ان محبوب شخصیتوں کا مرقع ہے جو اب مرحوم ہیں اس میں اقبال،

اصغر، سجاد حیدر، شاہ سلیمان، احسن مارہروی، جیسی ادبی شخصیتیں بھی ہیں اور سلیمان، مولانا ابوبکر، ایوب اور نصیر الدین علوی جیسے اشخاص بھی جن کے دل آویز نقش رشید صاحب کی بدولت محفوظ ہو گئے ہیں۔ ایک ذاکر صاحب، اس میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی پر سوز تابناک اور دلکش شخصیت کا تاثر ہے۔ دوسری شیخ نیازی جو یوں تو ایک بچے کی کہانی ہے اور بچوں کے لیے ہے۔ مگر جس میں روزمرہ زندگی کے اتار چڑھاؤ، بچوں کی نفسیات، والدین کے رکھ رکھاؤ کی بڑی شوخ و شنگ تصویر ہے شیخ نیازی اس انسان کی علامت ہے جس سے دوسرے انسان بیزار ہیں مگر جس کی چنگاری سے خدا مایوس نہیں ہے۔

رشید صاحب اردو کے ممتاز مضمون نگاروں میں سے ہیں۔ مضمون صحیح معنی میں من کی سوچ اور شخصیت کی آزاد روی ہے۔ یہاں نظارہ سے زیادہ نظر کی اہمیت ہے۔ رشید صاحب کی لے ربطی ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کی طرح ہے دونوں میں ایک اندرونی وحدت ہے جو جلوؤں کی کثرت میں سطحی نظر رکھنے والے کو نہیں سوجھتی، ان کے بہکنے میں ایک رمز اور ان کے منشا بہنے میں ایک منطق ہے۔ ان کی مزاح نگاری مہذب انسان کی وہ تند جبینی ہے جو ہر قصر میں روزن دیکھ لیتی ہے۔ خواہ وہ رومانیت کا رنگ محل ہو یا جذباتیت کا جادو۔ اور اقبال ہی کی طرح وہ قدیم کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ ان کے اس نظریے سے کسے اختلاف ہوگا۔ کہ کوئی نا معقول شخص معقول شاعر نہیں ہو سکتا جس شخص میں شریفوں کے اطوار نہ ہوں اس میں فنون لطیفہ کے آثار کیسے مل سکتے ہیں مگر یہاں معقول اور شریف بڑے پر فریب لفظ ہیں۔ رشید صاحب کے نزدیک ان کے معنی متعین ہوں، زندگی میں ان کی تعبیریں بدل جایا کرتی ہیں۔ رشید صاحب کو اصول سے زیادہ اشخاص سے، اداروں سے زیادہ افراد سے، نئے حسن کے دریافت کے مقابلے میں مانوس اور جانے پہچانے حسن سے۔ کثرت نظارہ کی بجائے وحدت نظر سے زیادہ شغف ہے۔ یہی ان کی طاقت اور یہی ان کی کمزوری ہے۔ اسی نے ان میں انفرادیت اور بانکپن پیدا کیا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے وہ جدید دور کے "درد و داغ اور سوز و ساز" سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہونے پائے۔ وہ اس بزرگ کی طرح

ہیں جو بچوں کے گھروندوں کو دلچسپی اور ہمدردی ....
سے مگر ذرا دور سے دیکھتا ہے حالانکہ کسی خلیل کی طرح بے دھڑک کود پڑنے سے آتش نمرود آج بھی گلزار ہو سکتی ہے۔

رشید صاحب کا ذہن انیسویں صدی کی ساری عظمتیں رکھتا ہے، اس کی انسانی دوستی اس کا اعتدال، اس کی وضعداری اس کی وفاداری، اس کی پختگی، اس کا استقلال، یہ نہ مدح ہے نہ قدح ایک حقیقت کا اظہار ہے۔

رشید صاحب کو لکھنا کسی نے نہیں سکھایا ہنس کو تیرنا کون سکھاتا ہے۔ ہاں انہیں غالب، اکبر اور شبلی سے سہارا ملا اور چیسٹرٹن، اسکر وائلڈ اور برناڈشا سے رموز فن۔ انکے یہاں بڑی پختگی، رچاؤ اور نکھار ہے اس کے پیچھے اردو فارسی، شعروادب کی صالح روایات کا بھرپور احساس ہے اور اس میں کتنی ہی کلاسیکل آوازوں کی گونج بھی۔ ان کا تخیل عجیب و غریب چیزوں میں ربط ڈھونڈ لیتا ہے اور ایک چابکدست کمہار کی طرح مٹی کے معمولی مسالے سے حسن وعشق کی پتلیاں بنا لیتا ہے" ندی اور عورت دونوں کا ایک ہی بیوہار ہے دونوں طاقت اور رفاقت پسند کرتی ہیں "" پولس اور یونیورسٹی دونوں تحقیقات پر ایمان رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ایک سزا دلواتی ہے دوسری سند دیتی ہے"، "کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک اور ہندوستانی سردی کھاتا ہے"۔ ان جملوں میں قول محال (Paradox) نے بڑی جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ ان کی تشبیہات بڑی خیال انگیز ہوتی ہیں ان کی حیثیت ایک پھلجھڑی کی سی ہے" شیخ پیرو کا قد ایک ببول کے تنے کے مانند ہے"، "صدر کرسئی صدارت پر اس طرح رونق افروز ہیں جیسے ڈیوٹ پر بٹھا لو"، "شراب کی بوتل اس طرح جیب سے باہر نکلے جیسے دلہن حجلۂ عروسی سے باہر نکلے یا بہادر کی تلوار نیام سے باہر آئے یا شباب کا خواب مجسم ہو جائے"، "پورب سے کالا کاجل سا بادل اٹھا گھٹتا جھومتا، پھنکارتا بل کھاتا ہوا جیسے انگریزوں کا ڈاٹڈ ناٹ کہیں پیام صلح لیے جا رہا ہو۔ یا کسی چمارن پر جوانی چھا رہی ہو"، محمد علی کی تحریر و تقریر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے"کس بلا کے بولنے والے اور لکھنے والے تھے بولتے تو معلوم ہوتا ابوالہول کی آواز اہرام مصری سے ٹکرا رہی ہے۔ لکھتے تو معلوم ہوتا کرپ کے

کارخانے میں توپیں ڈھل رہی ہیں یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج کا نقشہ مرتب ہو رہا ہے۔"
ماروا ڑی عورتوں کے متعلق ان کا یہ تبصرہ کہ "یہ گھونگھٹ، گندگی اور گہنے کا مجموعہ ہیں" ان کی ایک اور خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے وہ ہم آواز الفاظ سے بڑا کام لیتے ہیں اور ان کی نثر میں ترصیع بہت نمایاں ہیں۔

ان کی تحریروں میں بلاغت کے ساتھ ساتھ ندرتِ تخیل کی بڑی دلکش چاندنی ملتی ہے شیطان کی آدم کے متعلق رائے ہے اخی آدم میرے بڑے بھائی تھے لیکن نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل، ذرا یہ کرشمہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ یہ بندوق اپنی نہ نشانہ اپنا نہ ارادہ اپنا نہ مقصد اپنا صرف اپنے کندھے پر رکھ کر چھڑوالی۔ یہ نہ سمجھے کہ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اب جو کہتا ہوں کہ میاں یہ کیا کیا تو کہتے ہیں کہ ہم خلاصۂ کائنات ہیں"۔
"اسی مضمون میں لکھتے ہیں "آدم نے قولِ الٰہیہ کو مضمحل کر دیا تھا۔ انکارِ ابلیسی نے اسے شگفتہ بنا دیا۔ انکارِ ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا"۔
ایک موٹر کے متعلق گہر فشانی ملاحظہ ہو "رکی رہتی تو معلوم ہوتا کہ کوئی سنیاسی جس دم کیے ہوئے ہے۔ چلنے والی ہوتی تو معلوم ہوتا جاپان میں زلزلہ آرہا ہے، چلتی تو پھر نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"۔

رشید صاحب نے ہماری سماجی زندگی کی بڑی روشن تصویریں پیش کی ہیں۔ تھرڈ کلاس کی کھڑکی ہمارے عوام کی تصویر ہے "سر پر گٹھری اور بغل میں بستر ہے کاندھا الگنی کا کام دے رہا ہے انگلی بچے کے ہاتھ میں ہے شلوکے کے بند سے بیوی بندھی ہوئی ہے۔ کوئی ہانپ رہا ہے کوئی کانپ رہا ہے عورتیں کوس رہی ہیں، مرد ہاتھا پائی کر رہے ہیں بچے بلبلا رہے ہیں"۔

اخبار نویس کے لیے دستور العمل ملاحظہ ہو:
"اخبار نویس کو اس اصول پر چلنا چاہیے کہ اخبار سے کسی کو فائدہ نہ پہونچے۔ اخبار کو برابر فائدہ پہنچتا رہے۔ اخبار نویسی اس طرح شروع کرنی جیسے دین خطرے میں ہے قوم فنا ہو رہی ہے حکومت ناشدنی اور گردن زدنی ہے۔ لیکن ختم یوں کرو گویا تم نے

دین کی خاطر یا قوم کی حمایت میں یا حکومت کی مخالفت میں اخبار بند کر دیا اور بینک میں حساب کھول دیا۔" ان کے نزدیک عورتوں کی تین قسمیں ہیں بعض تو ایسی ہیں جنہوں نے سورج اور آسمان بھی نہیں دیکھے ہیں۔ گھروں میں بیٹھی رہتی ہیں۔ فاقہ کرتی ہیں بچے پالتی ہیں اور چکی پیستی ہیں۔ یہاں تک کہ در و دیوار کی چکی خود انہیں پیس ڈالتی ہے۔ بعض ایسی ہیں جو بہت پان کھاتی ہیں۔ چھالیاں کترتی ہیں شوہر کو گالی دیتی ہیں اور اپنے میکے والوں کی پرورش کرتی ہیں لیکن ایک قسم اور پیدا ہو گئی ہے۔ یہ انگریزی بولتی ہیں، ساڑی پہنتی ہیں اور سنیما دیکھتی ہیں۔ شوہر ان کی خدمت کرتے ہیں اور یہ قوم کی خدمت کرتی ہیں۔ نظام تعلیم پر تبصرہ دلچسپ ہی نہیں غور طلب بھی ہے۔

"یہاں پر ہر ایک کو ایک ہی قسم کا منتر پڑھاتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے سانپ سے کھیلنا سکھاتے ہیں۔ ایک قسم کا راتب دیتے ہیں۔ ایک ہی قسم کے کام لیتے ہیں۔ شکار پر گزران کرنے والوں کو مردار کھلاتے ہیں۔ کھیت جوتنے والے کو گورکنی سے واقف کراتے ہیں۔ ہرن پر گھاس لاد دیتے ہیں۔ نقش نگینے کا کام کرنے والے سے مگدر ہلواتے ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والے کو یورپ کا خواب دکھاتے ہیں۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکتے ہیں اور ایک راستے پر چلاتے ہیں۔"

رشید صاحب نے ہمیں کئی کردار دیے ہیں مرشد، حاجی بغلول، ماتا بدل، بجرو، انہیں ہندوستانی دیہات اور قصبوں کے حسن اور بدصورتی دونوں کی ہمدردی سے تصویر کھینچنی آتی ہے۔ وہ مکالمے کی کھنک اور اس کے لوچ کو تحریر میں منتقل کر سکتے ہیں وہ اشعار میں تصرف کر کے یا ان کی طرف اشارہ کر کے حسن آفرینی اور اختصار دونوں کا حق ادا کر سکتے ہیں وہ ہماری معلومات میں اضافے کے ٹھیکدار نہیں۔ ہمارے تاثرات میں تنوع، تناسب اور صحت مندی پیدا کرنے کے دعوے دار ہیں ان کی مزاح نگاری، مرقع نگاری اور تنقید میں وزن و وقار ان کی انشا پردازی سے آیا ہے۔ اکبر کی طرح ان کا قلم بھی "صفت لفظی" میں کامل ہے۔ ان کا نام آتے ہی بے ساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارات کیا ادا کیا"

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

"ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی"

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کو دو سال ہو گئے۔ یوں تو ان کا غم ابھی تازہ ہے، ان کی یاد میں برابر جلسے ہوتے ہیں، ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جاتا ہے، ان کی تصانیف کی چھان بین ہو رہی ہے، ساہتیہ اکاڈمی انہیں صحت کے ساتھ دوبارہ چھاپنا چاہتی ہے۔ رسالوں کے خاص نمبر اب بھی ان کے لیے وقف ہو رہے ہیں۔ حکومت نے بھی آزاد انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں مدد دی ہے، مگر بقول غالب ؎

حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آزاد کی شخصیت لاکھ نظر فریب سہی، مگر ہندوستانی سیاست میں ان کا رول زیادہ اہم ہے۔ شخصیت کی اہمیت اس راستے پر اس قدر مضبوطی سے گامزن رہنے کی وجہ سے ہے۔ آزاد بہت بڑے خطیب، صحافی، مدبر اور انشا پرداز سہی مگر ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کے صحیح رول کی طرف اپنی جدوجہد سے اشارہ کیا۔ انہوں نے اسلام کی آفاقی تعبیر کی، اس کی سچائی، بڑائی اور گہرائی دکھائی اور اسکے ذریعے سے ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ولولہ پیدا کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ پیام دیا کہ وہ کھلے دل سے اور بے دھڑک اپنا سارا سرمایہ وطن کی آزادی کی جدوجہد میں لگا دیں تاکہ اس طرح ان کا تہذیبی سرمایہ سب کی متاعِ عزیز بن جائے۔ وہ بڑے اچھے اور سچے مسلمان تھے اور اس لیے مذہب کا محدود اور تنگ تصور نہیں رکھتے

تھے۔ ان کا مذہب دلوں کو ملانے والا تھا۔ علیٰحدہ کرنے والا نہیں۔ وہ بڑے اچھے اور سچے ہندوستانی تھے۔ وہ اپنی قوم کی پستی سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور اس کی عظمت سے بھی، وہ جانتے تھے کہ یہ قوم اپنی عظمت کے لحاظ سے ہمالہ کی سی بلندی رکھتی ہے اور اپنی پستی کی وجہ سے خلیج بنگال کی تہ کی سی پستی۔ وہ اس پست و بلند کا مجموعی تصور رکھتے تھے اور اس کو اپناتے تھے۔ وہ وطن کی خدمت کو ایمان کا جز سمجھتے تھے، کیونکہ ایمان صرف اپنی جنت پکی کرنے کا نام نہیں۔ خلق اللہ کی محبت اور اس کی خدمت کرنے اور اس کو نیکی اور بھلائی کی طرف لے جانے کا نام ہے۔

پھر مولانا آزاد اردو زبان و ادب کے بھی بہت بڑے محسن ہیں۔ انہوں نے علمی نثر کے رنگ و آہنگ میں اضافہ کیا۔ اور گو ان کا اسلوب نثر کا اعلیٰ ترین اسلوب نہیں کہا جا سکتا، مگر ان کے کارناموں سے اردو نثر کا دامن ضرور وسیع ہوا۔ اور اردو زبان تو ان کی خدمات کو بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ گو وہ سامنے کی بات نہ کر سکے یعنی اردو زبان کو وہ حقوق نہ دلوا سکے، جن کا اردو مدت مطالبہ کرتے رہے ہیں، مگر اس کی ہندوستانیت اس کی قومی حیثیت ہماری مشترک تہذیب میں اس کی جگہ کو ضرور دوست دشمن سب سے منوا گئے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بنیادی کام کیا یعنی اردو دشمنی کی فضا کو بدلا۔ اردو کے اداروں کی ہمت افزائی کی، اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو گلے سے لگایا۔ اردو کی تعلیم اور چلن کے سلسلے میں سہولتوں پر برابر اصرار کیا۔ انہوں نے اردو دوستوں کو روٹھ کر علیٰحدہ بیٹھ جانے اور ماتم اور سینہ کوبی میں مصروف رہنے کے بجائے اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے اور اعتماد کے ساتھ اپنا حق مانگنے اور اس پر اصرار کرنے کی تعلیم دی۔ اردو کی تحریک میں آج جو مضبوطی ہے اس میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ مولانا جانتے تھے کہ پرجوش تقریروں اور ہنگامی تحریکوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہاں مسلسل جدوجہد اور پیہم کوشش سے بڑی بڑی چٹانیں راستے سے ہٹ جاتی ہیں۔ ہاں مسلسل جدوجہد کا راستہ چونکہ نسبتاً خاموش کام کا راستہ ہے اس لیے اس میں سستی شہرت ہاتھ نہیں آتی، سچی خوشی اور دور رس نتائج ضرور ملتے ہیں۔ اس چیز کا عرفان ہمارے یہاں کم ہے۔

اور مولانا پرانے ہوتے ہوئے ایسے نئے تھے کہ ہر نئی تحریک کی خوبی دیکھ سکتے تھے۔ ان میں

نہ پرانوں کی کٹھ ملّائیت تھی اور نہ نئی نسل کی رعونت اور سطحیت۔ ہمارے وطن کو صرف پرانے یا نئے لوگ نہیں چاہئیں، بلکہ ایسے لوگ چاہئیں جو ماضی کے عرفان کے ساتھ حال کا علم اور مستقبل کا احساس رکھتے ہوں اور نئے تقاضوں کے پرانے پن کو سمجھ کر اور برت سکیں۔ وہ قدیم علوم کے پروردہ تھے مگر انہوں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھیں اور اپنے ذہن کے دریچوں کو کبھی بند نہیں ہونے دیا۔ اسی لیے وہ حال کی بھول بھلیوں میں بھی کھو نہ سکے۔ انہیں اپنے راستے اور منزل کا احساس ہمیشہ رہا۔

مولانا آزاد کی یاد تازہ رکھنے کے لیے جلسے کرنا اور ان کے نام سے ادارے کھولنا کافی نہیں۔ مولانا کے مشن کو زندہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے یہی تین پہلو سب سے زیادہ اہم ہیں اور انہیں سے بلا امتیاز مذہب و ملت سب بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، وطن کے دکھ درد میں ہر حال میں شرکت، زبان کی خدمت کے ذریعے سے تہذیب کے صحیح خط و خال کو نمایاں رکھنے کی کوشش اور قدیم و جدید کی خلیج کو پاٹنے کی جرأت۔ انہیں تین پہلوؤں سے مولانا کی وہ انسان دوستی روشن ہوتی ہے جو ہماری متاعِ عزیز ہے اور جس کی نعمتوں اور برکتوں کو عام کرنا ہمارا فریضہ ہے۔ نقشِ پا کی شوخی راہ کو روشن کئے ہوئے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ راہ کتنی آباد رہتی ہے۔

امریکہ — چند تاثرات

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

جب سے میں واپس آیا ہوں جو سوال مجھ سے سب سے زیادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟ دراصل امریکہ جانے سے پہلے میں امریکہ کے متعلق اپنے یہاں کے اخباروں سے، امریکی اخباروں اور رسالوں سے وہاں کے ناولوں اور کہانیوں سے اچھا خاصہ واقف تھا، پھر علی گڑھ اور دہلی میں امریکہ کے ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات کر چکا ہوں ان میں وہ پروفیسر بھی ہیں جو یہاں اپنے موضوع پر مواد حاصل کرنے آتے ہیں اور وہ نوجوان بھی جو دہلی اور لکھنؤ کی سڑکوں پر بال بڑھائے، میلے کپڑے پہنے گھومتے ہیں اور موقع ملے تو بھیک مانگنے میں بھی عار نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے جدید امریکن شاعری جدید امریکن ناول اور افسانے اور جدید امریکن تنقید کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے امریکہ کے ذہن کے متعلق اور وہاں کے فنکاروں کی تخلیقی صلاحیت اور فنی شعور کے متعلق میری ایک سوچی سمجھی رائے ہے۔ اس لیے امریکہ جا کر وہاں چھ مہینے قیام کر کے وہاں کی ایک ممتاز یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر، وہاں کے کچھ اساتذہ سے مل کر، وہاں کے طلبا کی زندگی کو دیکھ کر، وہاں کے کتب خانے، میوزیم، بازار، عمارتیں، سڑکوں کا ہجوم، ہوٹلوں میں رہنے والوں کی زندگی، ٹی۔ وی کے آئے دن کے انٹرویو اور مباحثے، جلسے، ریلیں، بسیں، ہوائی جہاز، کتابوں کی دکانیں اور کچھ شہروں کے قابل دید مقامات دیکھ کر نہ تو میری آنکھیں خیرہ ہوئیں نہ مجھے مایوسی ہوئی، میں نے جس امریکہ کے متعلق پڑھا اور سنا تھا اور یہاں پر امریکنوں سے مل جل کر جو نظریہ قائم کیا تھا وہ یکسر غلط نہ تھا۔ ہاں وہ تاثر کچھ دھندلا کچھ

بے روح سا تھا، وہاں جا کر لوگوں سے مل کر وہاں کی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اب اس میں ایک آب و تاب ہے، ایک زندگی ہے، ایک گہرائی اور تنوع ہے جس کی وجہ سے میری نظر میں زیادہ تابانی آتی ہے، یہ ایک قیمتی تجربہ تھا اس سے ساری دنیا کے ایک ہونے اور انسانوں کی برادری کی مشترک قدروں کا اور ثبوت ملا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرق و مغرب کی اصطلاحیں پرانے معنی میں غلط ہوتے ہوئے اب بھی کچھ معنویت رکھتی ہیں اور مغرب صرف علم اور دولت اور مشرق صرف جہالت و غربت کا نام نہیں بلکہ مشرق کی بعض قدروں کو مغرب اپنا سکتا ہے اور اپنا رہا ہے اور مغرب کی قدریں تو خیر بے سمجھے بوجھے ویسے بھی ہمارے مشرق میں اپنائی جا رہی ہیں گو ان میں سے بعض سطحی ہیں۔

ایلڈس ہکسلے نے ہندوستان کے سفرنامہ میں کسی جگہ کہا ہے کہ ہندوستانی ہر جگہ سیاست کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ سیاست سے مفر نہیں، افسوس یہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاست کا مفہوم بہت سطحی ہے اور چند نعروں اور چند سیاسی پینتروں تک اس کی پرواز ہے ورنہ حقیقی سیاسی شعور تو ہر پڑھے لکھے انسان کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے یہاں غریبی اور جہالت ختم ہو، سماج میں جو بے انصافی ہے، وہ دور ہو، چند لوگوں کو تجوریاں بھرنے اور عوام کو مر مر کر جینے کے لیے نہ چھوڑ دیا جائے۔ جدید دور نے سائنس اور ٹکنالوجی کے جو وسائل مہیا کیے ہیں ان سے کام لے کر پیداوار کے قدیم طریقوں کو بدلا جائے۔ ملک میں صنعتوں کا جال پھیلایا جائے، آبادی کے خطرناک رفتار سے بڑھنے کو روکا جائے۔ فرقہ پرستی اور ذات پات کے تعصب کو دور کیا جائے۔ نوجوانوں کو جدید دور کے میلانات سے آگاہ کیا جائے۔ ان میں خود سوچنے اور خود کام کرنے کی لگن پیدا کی جائے ان کی توانائی کو صحیح راستے پر لگایا جائے جو تبدیلی زندگی کا قانون ہے وہ اس طرح لائی جائے کہ تاریخ کا ایک جامع تصور روایات کا ایک صالح تصور اور تہذیب کا ایک سائنسی تصور عام ہو سکے، مگر آزادی کے تیس برس کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ملک آگے تو بڑھا ہے مگر اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے اور ہمارے سیاست دانوں نے اقتدار کی ہوس میں ملک کے مفاد کو نظر انداز

کردیا ہے، پارٹی سب کچھ ہوگئی ہے ملک کچھ بھی نہیں رہا۔ اپنا اپنا خطہ یا علاقہ سب کے ذہن میں ہے ملک کے مفاد کا دھیان بہت کم لوگوں کو ہے، لوگ یا تو امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں یا روس کی طرف یا چین کی طرف اپنے من میں کوئی نہیں جھانکتا، لوگ فرقوں میں ٹولیوں میں، محاذوں میں، ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں یا امریکہ کے دوست بلکہ دست نگر ہیں یا روس کی نگاہیں دیکھتے ہیں یا چین کی طرف لو لگائے بیٹھے ہیں اس لیے امریکہ کے دوست امریکہ کو جنت ارضی سمجھتے ہیں، روس کے ہم نوا روس کو ایک مثالی ریاست اور چین کو پیرو چین کے عشق میں گاندھی جی کی تصویروں کی بے حرمتی کرنے سے نہیں چوکتے حالاں کہ امریکہ کے نظام کی خوبیوں کو مانتے ہوئے، روس کو دوست رکھتے ہوئے چین سے ہمدردی کرتے ہوئے، ہندوستان سامنے رہنا چاہیئے اور کسی کی نقالی یا کسی کے دامن دولت سے وابستگی کا بھول کر بھی خیال نہ کرنا چاہیئے۔

ہمارے ملک میں طرف دار بہت ہیں سخن فہم کم، اس لیے امریکہ کے متعلق عام تاثر دو طرح کا ہے، ایک جنت ارضی کا، دوسرا ایک جہنم کا۔ دونوں تصور سطحی ہیں امریکہ جنت بھی ہے جہنم بھی۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ امریکہ جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔ جنت اس لیے کہ دنیا کا سب سے مال دار ملک ہے، یہاں سو سے اوپر منزلوں کی عمارتیں ہیں۔ چھ چھ گلیوں کی چوڑی سڑکیں ہیں جن پر ہر وقت ساٹھ ستر میل کی رفتار سے موٹریں دوڑتی پھرتی ہیں۔ ہندوستان میں جو سائکل کی حیثیت ہے وہی امریکہ میں کار کی ہے گیس سستا ہے، ٹی۔ وی قریب قریب ہر گھر میں مل جائے گا اگر رنگین نہیں تو سیاہ و سفید۔ ملک بہت بڑا ہے اور اس کے رقبے کو دیکھتے ہوئے آبادی زیادہ نہیں۔ یعنی رقبے میں ہندوستان امریکہ کا اکتالیس فی صدی ہے اور آبادی میں دوگنے سے زیادہ، ہماری آبادی اب پچپن کروڑ سے کم نہ ہوگی امریکہ کی بیس کروڑ ہے۔ اور پھر آبادی کا دو تہائی حصہ قومی زمین کے دو فی صدی حصے میں ہے یعنی بڑے شہروں میں امریکہ میں جس کی آمدنی چار سو ڈالر سے کم ہے وہ غریب ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے پاس کار بھی ہو سکتی ہے

اور ٹی۔ وی بھی۔ چوں کہ زیادہ تر چیزیں قسطوں پر مل سکتی ہیں اس لیے معمولی گھروں میں بھی ضرورت کی سبھی چیزیں مل جاتی ہیں سیاہ فام لوگوں میں غریبی زیادہ ہے ان میں جرائم کی تعداد، خودکشی کی تعداد اور بچوں کی تعداد بھی زیادہ ہے عورتیں میک اپ پر خاصی رقم صرف کرتی ہیں اگرچہ نوجوان لڑکیوں میں اب سادگی کی طرف میلان بڑھ رہا ہے۔ مزدوری خاصی مل جاتی ہے معمولی چھوٹے موٹے کام کے لیے پونے دو ڈالر فی گھنٹہ، کھانے پینے کی چیزیں زیادہ مہنگی نہیں، مگر بعض چیزیں مثلاً دوائیں، علاج، حجامت، استری، ڈرائی کلیننگ، خاصے مہنگے ہیں۔ مکانوں کے کرایے خصوصاً بڑے شہروں میں برابر بڑھ رہے ہیں بہت سے لوگ علاوہ نوکری کرنے کے کسی اور جگہ بھی کام کرتے ہیں۔ امریکن والدین شروع میں بچوں کی بڑی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن بچے ذرا بڑے ہوئے پھر ان کی زندگی الگ اور ان کے والدین کی الگ، بوڑھوں کی حالت زیادہ قابل رحم ہے، یہ لوگ الگ تھلگ رہتے ہیں ان کے بچے ہفتے میں ایک دو بار ان سے ملنے آجاتے ہیں۔ جس ہوٹل میں میں رہتا تھا وہاں ایک پچانوے برس کی بڑھیا رہتی تھی۔ اس کا لڑکا ہفتے میں ملنے آتا تھا اور کھانے پینے کی کچھ چیزیں دے جاتا تھا، بیچاری بڑھیا جاڑے بھر ہوٹل سے باہر نہیں نکلی۔ شراب کا رواج عام ہے مگر بدمستی میں نے زیادہ تر سیاہ فام لوگوں میں دیکھی۔ امریکہ میں تشدد کی روایت پرانی ہے۔ جو لوگ پہلے پہلے یہاں آئے تھے انہوں نے یہاں کے پرانے باسیوں پر خاصے مظالم کئے (Westerns) کی روایت اتنی مقبول ہے کہ اب بھی ٹی وی پر اس قسم کے فلم شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہودی سرمایہ دار امریکہ کے تجارتی حلقوں اور سیاسی حلقوں پر ہی چھائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ یہاں کے دانشوروں، شاعروں، مصنفوں اور ناول نگاروں میں بھی ان کا عنصر زیادہ ہے۔ ان میں لبرل خیالات رکھنے والے بلکہ بائیں بازو کے دانشور بھی خاصی تعداد میں ہیں دفتروں میں، دکانوں میں، ہوائی اڈوں پر زیادہ تر عورتیں کام کرتی ہیں۔ یونیورسٹی میں بھی خواتین اساتذہ کی خاصی تعداد ہے۔ امریکہ میں کئی نسلیں مخلوط ہو گئی ہیں اس لیے ہر طرح کے چہرے آپ کو یہاں نظر آئیں گے، شام کو خاصی تعداد میں سیاہ فام شوہر اور سفید فام بیوی

یا سفید فام شوہر اور سیاہ فام بیوی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ دکان دار عام طور پر خاصے ایماندار نظر آئے۔ چیز ناپسند ہو تو بعد میں بھی واپس کر سکتے ہیں۔ ٹیلی فون بینک بجلی گھر وغیرہ میں بڑی پھرتی سے کام ہوتا ہے۔ آپ کو بینک میں دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ لگیں گے، لوگ عام طور پر خوش اخلاق ہیں۔ انگلستان کے لوگوں کی طرح سرد مہری سے کام نہیں لیتے، بات کرنے میں سبقت کرتے ہیں جنس کے معاملے میں خاصی آزادی ہے مگر ہر عورت (Mr. Rightman) یعنی موزوں ترین آدمی کی تلاش میں ضرور رہتی ہے۔

جب سے کالوں اور گوروں میں تناؤ شروع ہوا ہے، تشدد کے واقعات بڑھ گئے ہیں کالوں میں انتہا پسندی آگئی ہے، ان کا کہنا ہے کہ اعتدال پسند گوروں نے ان کے حالات کو بدلنے کے لیے باتیں زیادہ کیں، عملی کام کم کیا، اب وہ ان حالات کو بدلنے پر تلے ہوئے ہیں، اور ان میں (Black Panthars) یعنی سیاہ تیندوں کی جماعت سب سے زیادہ مقبول ہے اس میں بعض پڑھے لکھے نوجوان بھی شامل ہیں۔ امریکہ کا برسر اقتدار طبقہ کالوں کی اس انتہا پسندی سے خائف بھی ہے اور اس پر برہم بھی، مگر نوجوانوں میں عام طور پر کالوں کے ساتھ انصاف کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ ابھی حال تک یورپ کے لوگوں کو امریکہ آنے کی پوری آزادی تھی، مگر ایشیا اور افریقہ کے لوگوں کی بہت تھوڑی تعداد کو اجازت ملتی تھی، مگر اب ایشیائی ممالک سے کچھ زیادہ تعداد میں لوگ آتے ہیں، ہندوستان اور پاکستان سے خاصی تعداد میں لوگ امریکہ آگئے ہیں سبھی کو کوئی نہ کوئی کام مل گیا ہے وہاں کے لوگوں کا عام تاثر یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان سے لوگ صرف روپیہ کمانے آتے ہیں خرچ کرنا نہیں جانتے۔ حالاں کہ امریکہ کا سماج خرچ کرنے کا سماج ہے امریکہ میں ہر چیز بڑے پیمانے پر ہے، اگر علمی سرگرمی ملے گی تو بڑے پیمانے پر، اگر بے ایمانی ہو گی تو وہ بھی بڑے پیمانے پر، تفریحی پروگرام بھی بڑے پیمانے پر، غرض ہر چیز (Larger then life) معلوم ہوتی ہے۔

امریکہ میں کتب خانے اور میوزیم بڑے شاندار ہیں یونیورسٹیوں کے کتب خانوں کو چھوڑیئے شہروں کی پبلک لائبریریاں یہاں کی بڑی بڑی لائبریریوں سے بڑی

ہیں میوزیم ایسے ہیں کہ دیکھ کر آنکھیں کھل جائیں۔ شکاگو میں میں نے تین میوزیم دیکھے ایک نیچرل ہسٹری کا، جس میں وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ کی قدیم آبادی کے آثار بڑی محنت اور کوشش سے جمع کیے گئے ہیں دوسرا سائنس اور صنعت کا جس میں سائنس کے ہر شعبے اور صنعت کے ہر گوشے کے متعلق ماڈل، معلومات، چارٹ اور نقشے ہیں، تیسرا جدید آرٹ کا جس میں یورپ اور امریکہ کے مشہور فن کاروں کی اصل تصویریں بڑی تعداد میں موجود ہیں، جب میں نے اس میوزیم کی اپنے ایک دوست سے جو عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں بہت تعریف کی تو کہنے لگے کہ یہ سب پیسے کا کھیل ہے۔ بات غلط نہیں ہے۔ یہ تصویریں مختلف لوگوں نے بڑی بڑی رقمیں دے کر خریدی تھیں اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے میوزیم کو دے دیں مگر یہ بھی تو ملحوظ رکھنا ہے کہ فن کی سرپرستی کس طرح کی گئی ہے اور کس طرح دنیا بھر کی فنکاری، لوگوں کی نظر، شخصیت اور تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے مہیا کر دی گئی ہے۔ میں نے ہر موزیم میں بڑی تعداد میں بچوں کو دیکھا جو نوٹ لے رہے تھے، انہیں اپنے اسکول میں ان چیزوں پر رپورٹ دینی ہوتی ہے۔ گویا میوزیم تعلیم کا ایک جز ہیں۔

امریکہ کے لوگوں میں آج بھی صنعت کے کمالات سے گہرا لگاؤ ہے۔ ان کے پیچھے وقت کو بچانے کا جذبہ خاص طور پر کام کرتا ہے۔ اشتہار کو ان لوگوں نے فن بنا دیا ہے۔ ٹی۔ وی پر ایک اشتہار اکثر دکھایا جاتا تھا۔ ایک شخص کو زکام ہے کھانسی ہے وہ پہلے ایک شیشی سامنے کی جیب میں رکھتا ہے اسے یہ جگہ اچھی نہیں لگتی وہاں سے نکال کر پتلون کی جیب میں ٹھونستا ہے۔ یہ جیب اسے بہت بھاری معلوم ہوتی ہے اس کے بعد آخر میں اس جیب میں رکھ لیتا ہے جو کولہے پر ہے۔ اس سے مطمئن ہو کر وہ گولیوں کا ایک پیکٹ پھاڑتا ہے ایک گولی منہ میں رکھتا ہے، مزا لیتا ہے باقی گولیاں سامنے کے جیب میں ڈال دیتا ہے اور خوش خوش اپنا راستہ لیتا ہے۔ اس اشتہار کو دیکھ کر میں نے بھی وہ دوا خریدی۔ ایک دوسرا اشتہار برمودا کے جزیروں کے منظر کا تھا۔ سمندر کی لہریں ایک طلسمی جال سا بن رہی ہیں۔ دوسرے منظر میں فرش کی دری میں وہی ڈیزائن ہے۔ اب ایسی رنگا رنگ دری خریدنے کو کس کا دل نہ چاہے گا؟ ایک اشتہار برف کے کھیلوں کا

تھا جس میں برف کے مختلف منظر دکھائے گئے تھے۔ یہاں تعریف کرنے والا اچانک برف میں دھنس جاتا ہے، ایک اور اشتہار میں اچھا خاصہ مکالمہ تھا جس میں ایک آدمی ایک ہاضمے کی دوائی کی تعریف کرتا ہے، دوسرا کہتا ہے یہ نسخہ فلاں کمپنی سے چرایا گیا ہے، پہلا اپنی خصوصیت بیان کرتا ہے، دوسرا اسے چھیڑتا ہے، اشتہاروں میں لوگوں کی نفسیات سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاتا ہے، محض خطابت، یا قصیدہ خوانی نہیں ہوتی۔ بعض میں صرف اعداد و شمار کا رعب ڈالا جاتا ہے اس لیے خیال کو فروخت کرنے (To sell an idea) کا محاورہ بن گیا ہے، میں بِک گیا کے معنی کا قائل ہو گیا۔ چوں کہ ڈاکٹر اور علاج دونوں مہنگے ہیں اور چوں کہ سر کے درد کی شکایت یا بے خوابی کی شکایت عام ہے اس لیے زیادہ تر اشتہارات یا تو دوائوں کے ہیں یا عورتوں کے سامان آرائش کے۔ ٹی۔ وی کے فن کار اچھے خاصے ہیرو ہیں ان میں مزاحیہ کردار خاص طور سے پسند کئے جاتے ہیں اور مختلف شعبوں کے ماہرین یا مشہور لوگوں سے انٹرویو بھی مقبول ہوتے ہیں۔ سیاہ فام فنکار بھی خاصے مقبول ہیں شکاگو کے ٹیلی ویژن میں ایک (Channel) تعلیمی ہے یہ بہت اچھا ہے، اس میں جدید ترین ڈرامے، مشہور مصنفین کی کتابوں پر تبصرے، مصنفین کے انٹرویو، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر مباحثے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ عام طور پر اچھی فلمیں سبھی ٹی۔ وی پر دکھائی جاتی ہیں ہر بڑے شہر کا اپنا ٹی وی اسٹیشن ہے اور اس کا خاص پروگرام خبروں کے کئی دور ہوتے ہیں۔ موسم کی خبروں کی خاص اہمیت ہے اور یہ خبریں عام طور پر صحیح پیشین گوئی کرتی ہیں خبروں کے بعد مبصر حالات حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک لین او کانر (Lenoconner) کو میری بیوی بھُنّا کہا کرتی تھیں کیوں کہ یہ ناک میں بولتا تھا اور اپنا نام آخر میں اس طرح بتاتا تھا کہ گویا یہ نام بھی تقریر کا ایک جز ہے۔ ایک دفعہ اخباروں میں نائب صدر اسپیرو اگینیو (Spirs Agnew) کا ایک بیان کچھ اخباروں اور ٹی۔ وی کے مبصروں کے خلاف نکلا تھا، جس میں نائب صدر نے آخر میں کہا تھا کہ یہ لوگ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں جملے کا لطف انگریزی میں ہے (Who the hell They think they one)، اکاونر نے اس پر تنقید کی اور آخر میں

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

نائب صدر سے یہی سوال کیا کہ وہ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں؟ صدر نکسن اور نائب صدر کا بعض اخبار اور ٹی۔ وی کے مبصر جس طرح مذاق اڑاتے تھے وہ حیرت انگیز چیز تھی پھر یہ اخبار والے کسی چیز کو راز نہیں سمجھتے، بلکہ ہر نقاب کو اٹھانا اور ہر راز کو فاش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ نوجوانوں کی بغاوت، عورتوں کی ہر معاملہ میں مساوات کی جدوجہد، حمل ختم کرنے کا جواز، فضا کی گندگی، ویت نام، ہاؤسنگ کے مسائل، بڑے شہروں کی زندگی، مغربی ایشیا، بلیک پینتھرس (Black Panther)، یونیورسٹی کی تعلیم کے مقاصد پر اکثر گرم گرم مباحثے ہوتے ہیں۔ اخباروں میں زیادہ تر اشتہارات ہوتے ہیں اتوار کا ایڈیشن کبھی کبھار چار سو صفحے کا ہوتا ہے۔ عام طور پر لوگ اپنی دلچسپی کے حصے لے لیتے ہیں، باقی پھینک دیتے ہیں۔ میں نے امریکہ کے اخباروں میں خاص بات یہ دیکھی کہ عام طور پر نامہ نگاروں یا خاص نمائندوں کے مراسلے زیادہ ہوتے ہیں اسی طرح خبریں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک شخصی انداز سے بیان کی جاتی ہیں تمام اچھے اخبار، ایک میگزین بھی نکالتے ہیں جس میں نئی کتابوں پر تبصروں کے علاوہ علمی و ادبی مضمون بھی ہوتے ہیں پہلے نیویارک ٹائمس کا ادبی میگزین نیویارک ٹائمس بک ریویو خاصہ معیاری ہوتا تھا، مگر اب کئی سال سے نیویارک ریویو آف بکس اس سے بہتر نکلتا ہے۔ اس میں یورپ اور امریکہ کے چوٹی کے لکھنے والے کتابوں پر طویل تبصرے لکھتے ہیں اور ان کے ساتھ بڑے اچھے کارٹون بھی ہوتے ہیں، میرے نزدیک نیویارک ریویو آف بکس، ٹائمس لٹریری سپلی منٹ سے بہتر پرچہ ہے مجموعی طور سے اسے لبرل کہا جاسکتا ہے۔ اور یہ نئے میلانات کی اکثر عکاسی کرتا ہے۔

امریکہ میں چھ سال سے یونیورسٹی کے طلبا میں ہیجان ہے جو بعض اوقات ہنگاموں کی صورت اختیار کرلیتا ہے اس وقت تقریباً آٹھ سو یونیورسٹیوں اور تقریباً ڈیڑھ ہزار کالجوں میں ستر لاکھ طلبا پڑھتے ہیں ہمارے یہاں یونیورسٹیوں کے طلبا کی تعداد پندرہ اور بیس لاکھ کے درمیان ہوگی اور آزادی کے بعد تیزی سے بڑھ رہی ہے مگر امریکن کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبا کی مجموعی تعداد آبادی کے تناسب سے بھی ہمارے یہاں سے بہت زیادہ ہے اور ویسے بھی وہاں کے ہنگاموں کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اس تعداد کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے۔ دوسری بات یہ اہم ہے کہ

ان طلبا کے گھروں پر اور اسکولوں میں تربیت ہمارے یہاں سے زیادہ آزاد ماحول میں ہوتی ہے۔ جو لوگ خوش حال ہیں وہ اپنے بچوں کو بہترین اداروں میں بھیجتے ہیں جو اتنے خوش حال نہیں ہیں ان کے لیے بھی اسکول ہمارے یہاں سے بہت بہتر ہوتے ہیں اسکول کے لڑکوں کی عام معلومات خاصی ہوتی ہے اور پھر بقول میک لوہن، امریکی بچے چھوٹی عمر سے ٹیلی ویژن اور دوسرے آلات کی مدد سے ایک طرح کا قاموسی علم حاصل کر لیتے ہیں گو اس علم میں چند خاص پہلوؤں پر زور ضرور ہوتا ہے امریکہ کے متوسط طبقے کے والدین اپنے بچوں کو شروع سے خاصی آزادی دیتے ہیں ذہنی صلاحیت اور آزادی خیال نے ان میں ایک روحانی پیاس اور ایک ذہانت پیدا کر دی ہے وہ اس آدرش کے قائل نہیں ہیں جو روپیہ کمانے، باعزت زندگی بسر کرنے، کامیابی کے مدارج طے کرنے، مقررہ پروگرام کے مطابق تعطیل منانے گویا ایک پٹری پر چلنے کو زندگی سمجھتا ہے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آزادی سے ملتے ہیں (Dating) کا رواج عام ہے گویا ایک (Pre missine Society) وجود میں آرہی ہے۔ اب یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ برکلے، کیلی فورنیا کے طالب علموں کا نعرہ محبت کرو نہ کہ جنگ (Let us" make love not war) کیوں مقبول ہوا۔ ویت نام کی جنگ برسر اقتدار طبقے نے ان نوجوانوں پر لاد دی ہے، شروعات کینیڈی کے زمانے سے ہوئی مگر جانسن نے ساڑھے پانچ لاکھ امریکن سپاہی وہاں بھیجے اور اس مقصد کے لیے نوجوانوں کو جبرًا بھرتی کیا گیا ویت نام ایک ایسی دل دل بن گیا ہے جس میں امریکہ کے دیو کے پیر دھنستے ہی جاتے ہیں۔ اب تک بیالیس ہزار نوجوان وہاں کام آچکے ہیں۔ زخمیوں کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ بھرتی میں سیاہ فام لوگ خاصی تعداد میں لیے جاتے ہیں۔ لڑائی کے محاذ پر ان سے اچھا سلوک ہوتا ہے، مگر جب وہ واپس آتے ہیں تو سیاہ اور سفید کی تفریق سے سابقہ پڑتا ہے قدرتاً انہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک جہنم سے نکال کر دوسرے جہنم میں ڈال دیا گیا ہے سفید فام نوجوانوں کی تربیت لبرل ماحول میں ہوتی ہے وہ لڑائی کو حق بجانب قرار نہیں دے سکتے کچھ لوگ ایسے اعصاب زدہ ہو جاتے ہیں کہ ذرا سی بات پر نہتے شہریوں

پر گولیاں برسانے لگتے ہیں فوجی افسر عام طور پر ایسے واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں مگر خدا کچھ اخبار نویسوں اور کچھ ٹی۔ وی کے مبصروں کا بھلا کرے، وہ ہر راز کو فاش کرنے پر تلے رہتے ہیں، غرض یونیورسٹی کے طلبا دیت نام کی لڑائی جبری بھرتی اور امریکہ کی ساری دنیا کی چودھراہٹ کے خلاف ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی بات دوسری تھی۔ یورپ سے امریکا کا گہرا ذہنی، روحانی، تہذیبی اور جسمانی رشتہ ہے، وہاں کی ساری سفید فام آبادی کے باپ دادا یورپ سے آئے تھے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، پھر جاپان نے پیرل ہاربر پر حملہ کر کے پوری امریکی قوم کو سخت غصہ دلایا تھا، چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں امریکہ کا نوجوان برسر اقتدار طبقے کے ساتھ تھا مگر ویت نام کی بات دوسری ہے۔ ان نوجوانوں کے کئی سال کے احتجاج، ہنگاموں اور کبھی کبھار تشدد آمیز مظاہروں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ صدر نکسن بھی آج نہ صرف امریکہ کی فوجوں کی واپسی کی بات کرتے ہیں بلکہ کافی تعداد میں انہوں نے فوجی واپس بلائے ہیں لیکن چاسکی اور اسٹون جیسے دانشوروں کا کہنا یہ ہے کہ نکسن بظاہر اس احتجاج سے مجبور ہو کر آدھے فوجی واپس بلالیں گے، مگر کسی نہ کسی صورت میں ڈھائی لاکھ امریکن فوجی اس علاقہ میں ابھی عرصہ دراز تک رہیں گے حال میں کمبوڈیا میں مداخلت پر کینٹ یونیورسٹی میں جو ہنگامہ ہوا ہے اس نے دوسری یونیورسٹیوں کو بھی متاثر کیا ہے، اور آئندہ بجائے تشدد آمیز مظاہروں کے نومبر کے انتخابات کے لیے ایک ایسے امیدوار کی حمایت نوجوان بڑے پیمانے پر کریں گے جو دیت نام میں کسی نہ کسی طرح جنگ کے خاتمے اور باعزت صلح پر زور دیں اور امریکہ کی ساری فوجوں کو جلد سے جلد واپس بلانے میں کامیاب ہوں۔ شکاگو یونیورسٹی سے ایک خط میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس زمانے میں یونیورسٹی بند رہے گی تاکہ طلبا اور اساتذہ انتخاب کے لیے کام کر سکیں قیاس ہے کہ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی یہی صورت پیش آئے گی۔

ایک اندازے کے مطابق یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پندرہ فی صد طالب علم ان مظاہروں میں حصہ لیتے ہیں۔ یہ تعداد اور بڑھے گی ویت نام کے علاوہ ان

مظاہروں میں کالے اور گورے کی تفریق کے خلاف آواز اٹھائی جاتی ہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کو زیادہ بامعنی اور بامقصد بنانے اور نصاب میں ضروری تبدیلیاں کرنے پر اصرار ہوتا ہے ساتھ ساتھ دوسرے سماجی مسائل بھی لیے جاتے ہیں، ایک تھوڑی سی تعداد کو چھوڑ کر مجموعی طور پر طلبا سنجیدہ دیانت دار اور ذہنی طور پر بیدار ہیں اور عنقریب امریکہ کی سماجی زندگی میں بڑی تبدیلیاں کریں گے۔

امریکہ کا سماج صنعتی سماج ہے، اس صنعتی سماج نے سائنس اور ٹکنالوجی کی بدولت بڑی ترقی کی ہے، اور اس کی دولت، طاقت، معلومات اور امکانات کی بظاہر کوئی حد نہیں معلوم ہوتی اس کے حامیوں کا کہنا ہے کہ اس نے غریبی کے خاتمے اور ایک مستقل خوشحالی کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں اس نے سب کے لیے مساوی مواقع فراہم کئے ہیں۔ اس نے فرد کی آزادی میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے اس نے انسانوں کی بہت بڑی تعداد کے لیے کام کے بجائے فرصت (Leisur) کی سہولتیں عطا کی ہیں، اس نے ریگستانوں کے رہنے والوں کے لیے دانہ پانی اور عام آبادی کے لیے ایک پرامن سماجی انقلاب کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اس نے طاقت پر دانشمندی کی فتح کے لیے فضا ہموار کی ہے، اور آئیڈیالوجی کی بحث کو بے معنی قرار دیا ہے، چاند کی فتح ٹکنالوجی کا ہی کارنامہ ہے اور بعض لوگوں کے نزدیک تو یہ فضا کی تسخیر کی پہلی منزل ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان باتوں میں خاصی صداقت ہو بھی تو ٹکنالوجی کی ترقی صرف برکت ہی نہیں لائی، کچھ لعنتیں بھی لائی ہے۔ ٹکنالوجی کی وجہ سے بیماری پر فتح آسان ہوئی اور بیماری پر فتح اور پیداوار کے لیے جدید ترین آلات کے استعمال نے آبادی کے پھٹ پڑنے (Population explosion) کا اسیب کھڑا کر دیا ہے۔ پھر جوہری توانائی کے دریافت کرنے اور اسیر کرنے پر جو روپیہ خرچ ہوا ہے اور جو مہارت صرف ہوئی ہے اس نے ایک تو جاپان میں پچیس برس پہلے لاکھوں کی آبادی کو ختم کر دیا اور اب ساری دنیا کے تہس نہس ہو جانے اور اس دھرتی کے ایک سلگتے ہوئے ویرانے میں تبدیل ہو جانے کے خطرے کو ہم پر مسلط کر دیا ہے۔ ٹکنالوجی کے حمایتی کہتے ہیں کہ اگر آبادی میں اضافہ

پر پابندی لگادی جائے اور جنگوں کو ایٹمی احتساب کے ذریعہ ناممکن بنادیا جائے تو ٹکنالوجی کا مشن پورا ہوسکتا ہے اور وہ انسانیت کے لیے تمام تر رحمت بن سکتی ہے۔

امریکہ کے دانشور آج کل اس مسئلہ کے ہر ہر پہلو پر بحث کر رہے ہیں اس سلسلے میں ہارورڈ یونیورسٹی کے ٹکنالوجی اور سماج کے پروگرام کی طرف سے جو چوتھی رپورٹ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی ہے اس پر نیویارک ٹائمس میں خاصہ مفصل تبصرہ شائع ہوا ہے اور جولائی ۱۹۶۹ء میں نیویارک ریویو آف بکس نے اس پر ایک طویل مضمون شائع کیا۔ رپورٹ میں ڈاکٹر میس تھین (Mes Thene) نے اس کا اعتراف کیا تھا۔

"ٹکنالوجی انسانوں کے چارۂ کار اور عمل کے لیے نئے امکانات پیدا کرتی ہے لیکن ان کے انجام کو غیر یقینی چھوڑ دیتی ہے اس کے اثرات کیا ہوں گے اور یہ کن مقاصد کو پورا کرے گی، یہ باتیں ٹکنالوجی طے نہ کرے گی بلکہ وہ آدمی طے کریں گے جو اس کا استعمال کرین گے ٹکنالوجی تو ایک مستقبل وجود میں لاتی ہے جس میں ہر طرح کے امکانات ہیں۔"

آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے:

"نئی ٹکنالوجی انسانوں اور سوسائٹیوں کے لیے نئے امکانات پیدا کرتی ہے اور ان کے لیے نئے مسائل بھی کھڑے کر دیتی ہے اس کے مثبت اور منفی دونوں اثرات ہیں اور عام طور پر یہ دونوں ایک ہی وقت میں اور ایک دوسرے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔"

یہی بنیادی سوال ہے جو ہر سنجیدہ مخلص اور دردمند انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس کا وہ سیدھا سادہ جواب کم سے کم مجھ کو تو مطمئن نہیں کرتا جو گال بریتھ (Gal Braith) جیسے لبرل دیتے ہیں کہ جیسے جیسے دانشمندی طاقت پر غلبہ پاتی رہے گی، صنعتی زندگی کے تضادات ختم ہوتے جائیں گے، کیوں کہ یہ انسانی ذہن کو صرف عقلیت اور خیر کا حامل سمجھتا ہے حالاں کہ انسانی ذہن میں جو جارحانہ میلانات اور جو تخریبی صلاحیتیں ہیں

ان کو بھی دھیان میں رکھنا چاہیئے میرے نزدیک اس کا یہ جواب بھی شافی نہیں ہے کہ یہ سب خرابیاں سرمایہ دارانہ نظام کی ہیں اور سوشلسٹ سماج میں ان کو یقیناً دور کر لیا جائے گا، اصل سوال یہ ہے کہ صنعتی زندگی ایک دودھاری تلوار ہے کہ نہیں یہ دوسری بات ہے کہ اس کی ترقیوں کے ساتھ اس کی لعنتیں ابھی امریکن سماج میں زیادہ رونما ہوئی ہیں روس اور دوسرے سوشلسٹ یا کمیونسٹ ملکوں میں کم، یہاں یہ سوال بھی نہیں ہے کہ ان دونوں نظاموں میں کون سا بہتر ہے، امریکہ کے دانش ور یہ محسوس کر رہے ہیں کہ ٹکنالوجی نے نئے سوال کھڑے کر دیئے ہیں اور سماج میں ماہرین کا ایک طبقہ پیدا ہوتا جا رہا ہے جو اپنی صلاحیت اپنی طاقت اور اپنے وسائل کی وجہ سے عوام سے دور ہوتا جا رہا ہے اور بالآخر ایک خصوصی طبقے کو جنم دیتا جا رہا ہے جو عوام کے حقوق سے زیادہ اور سماجی خیر سے زیادہ، اپنی طاقت کو برقرار رکھنے اور اس کے لیے ایک خاص فوجی نظام، ایک خاص دفتر شاہی، اس کی ایک خاص اصطلاحی زبان اور کمپیوٹر کے ذریعہ سے بڑے بڑے اداروں کی قیادت اور بڑے بڑے پروگراموں کے انجام دینے میں مصروف ہے، میرے نزدیک نوجوانوں کی بغاوت دراصل اس بڑھتی ہوئی ٹکنالوجی اور اس کے اثرات کے خلاف ہے جس کے نتیجے میں بہت سی سیاسی اور سماجی مسئلے پیدا ہوئے ہیں اور یونیورسٹیوں کی موجودہ تنظیم کے خلاف جذبہ بھی اسی وجہ سے ہے کیوں کہ بالآخر تمام اہم یونیورسٹیاں اس صنعتی نظام کو تقویت پہنچاتی ہیں گو اس کے ساتھ ساتھ چوں کہ یہ یونیورسٹیاں ہیں اس لیے اس کے خطروں سے آگاہ کرنے والے بھی انہیں کی گود سے ابھرتے ہیں۔

امریکہ اس مسئلہ کا حل کیا نکالے گا اس پر بہت کچھ دنیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔ نوجوان ٹکنالوجی کے خلاف نہیں ہیں اقبال کے الفاظ میں صرف مشینوں اور مشینی ذہن کی حکومت کے خلاف ہیں۔ امریکہ میں چوں کہ مختلف نسلوں کے لوگ موجود ہیں یعنی ان کے پاس انسانی دولت کی بہتات ہے اور ان کے وسائل بھی بے شمار ہیں اس لیے اس کے نوجوانوں سے یہ امید بندھتی ہے کہ وہ اس کا کوئی حل نکال لیں گے، یہ حل تمام طبقوں خصوصاً بچھڑے ہوئے کالوں کے پورے سماج میں برابر کی شرکت اور نوجوانوں کی

ذہنی توازن اور شخصیت کے ہمہ جہت فروغ کی کوشش میں نظر آتا ہے جو اپنے گھر کی درستی کو دنیا کی چودھراہٹ پر مقدم سمجھتا ہے اور بڑے بڑے شہروں کے جنگل کے بجائے جن میں فرد کھو جاتا ہے، نسبتاً چھوٹے چھوٹے شہروں میں پھیلی ہوئی صنعتوں، فطرت کی آغوش، ادب اور فنون لطیفہ کی ترقی، ہوا کی پاکیزگی، صنعتی گندگی (Industrial waste) کے تدارک پر زور دیتا ہے یعنی ٹکنالوجی پر انسانیت کی فتح کا آغاز کرتا ہے، اس راستے پر چل کر امریکہ کے نوجوان ملک کی سیاسی الجھنوں کا حل بھی نکالیں گے۔ میرا خیال یہ ہے کہ گاں بریتھ کے راستے پر ہی نہیں بلکہ ان نوجوانوں کے راستے پر چل کر امریکہ اپنی اور دنیا کی فلاح کا راز پالے گا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ نکسن اور اس کے ہم خیالوں کی ہار زیادہ دور نہیں ہے۔

تشدد امریکہ کی زندگی میں خاصی اہم روایت رہا ہے۔ امریکہ کی آبادی اور ترقی میں شروع سے تشدد کے بڑے پیمانے پر استعمال کی مثالیں ملتی ہیں، جو لوگ سب سے پہلے یہاں آکر بسے انہوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں ریڈ انڈین قبائل کے ساتھ بڑی بے رحمی کا برتاؤ کیا اور ان کے علاقوں سے انہیں مار کر نکال دیا۔ پھر یورپ سے جو لوگ آئے تھے وہ بھی سب شرفا کے گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان میں ایسے لوگ بہت تھے جو ڈنڈے کے زور سے اپنا کام نکالنا جانتے تھے، وسطی اور مغربی امریکہ کے وسیع علاقوں کے جنگلوں، گھاس کے میدانوں، ریگستانوں، پہاڑوں کی تسخیر کچھ اس طرح ہوئی کہ رفتہ رفتہ (Westerns) کے نام سے ایسے ناولوں اور فلموں کا ایک انبار لگ گیا ہے جن میں تشدد، خون ریزی، بہادری، سرفروشی کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں پھر امریکہ نے انفرادی آزادی پر شروع سے زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رابرٹ کنیڈی کے قتل پر سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑی اور اخباروں اور ٹی۔ وی پر اسلحہ کے خریدنے کی عام سہولت پر پابندی لگانے کی مہم شروع ہوئی تو بالآخر اس انفرادی آزادی کے نام پر مگر دراصل بعض اسلحہ کے تاجروں کے کاروبار کو بچانے کے لیے اس مہم کی مخالفت کی گئی، اس وقت امریکہ کے دانشور تشدد کے مسئلے پر بڑے

زور و سور سے بحث کر رہے ہیں۔ نیویارک ریویو آف بکس میں مشہور دانش ور ہینا آرنٹ (Hanwah Arendt) نے ایک طویل مضمون لکھا تھا جو ایک خاص ضمیمے کے طور پر شائع ہوا تھا، اس میں اس مشہور مصنف نے ایک دلچسپ بات یہ کہی تھی کہ جیسے جیسے ایٹمی طاقت بڑھتی جاتی ہے، عالمی جنگ کے لیے خود بخود ایک پابندی وجود میں آتی جاتی ہے کیوں کہ سب کی تباہی یقینی ہے مگر بین الاقوامی پیمانے پر تشدد کے استعمال میں دقّت ملک کے اندرونی معاملات میں تشدد کے استعمال کو تقویت دیتی ہے اس طرح اصلاحی کوششیں مثلاً کالے گورے کی تفریق یا طلبا کی یونیورسٹی کے نظام کو بدلنے کی جدوجہد دراصل اس لیے جارحانہ ہوتی ہیں کہ اس کے بغیر اصلاح کی صورت نہیں نکلتی اور لوگ اصلاح کی ضرورت کے قائل نہیں ہوتے۔ گویا یہ تشدد پرستی نہیں ہے تشدد کا ایک خاص استعمال ہے، اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب بڑے پیمانے پر ایک ایسا دفتری نظام وجود میں آجاتا ہے جس کے شکنجے میں عام آدمی گرفتار ہوتا ہے، جب آدمی کا سابقہ آدمیوں سے نہیں صرف مشینوں یا دفتروں سے ہوتا ہے تو تشدد کو خود بخود ہوا ملتی ہے اور امریکہ میں طلبا کی موجودہ شورش یا دو سال پہلے فرانس میں طلبا کی شورش، دراصل اسی دفتری اور مشینی تعلیم کے خلاف بغاوت کا ایک مظہر کہی جا سکتی ہیں، بعض دوسرے دانشور صنعتی نظام یا ٹکنالوجی کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ نارمن برن بام (Norman Birn Baum) صنعتی سماج کے بحران (The Crisis of Industrial Society) میں کہتا ہے کہ صنعتی نظام ایک نئے دانشور طبقے (Eliet) کو جنم دیتا ہے۔ جو اپنی حکومت باقی رکھنے کے لیے خاصی سختی کرتا ہے، اس کے نزدیک پبلک سیکٹر اور پرائویٹ سیکٹر دونوں کے افسر اس معاملے میں ایک سے ہوتے ہیں اس لیے صنعتی نظام سماج میں تشدد کو بالآخر ہوا دیتا ہے۔ امریکہ کے کچھ ماہرین نفسیات انسان کی فطرت میں تخریبی پہلو پر زور دیتے ہیں گو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کو ایک اور رخ دیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ سے بجائے لوگوں کو ہلاک کرنے کے پرانے اور فرسودہ نظام کو ختم کر کے ایک زیادہ متوازن سماج کے لیے راستہ ہموار کیا جا سکتا ہے بہرحال بڑے اور طاقت ور ملک، بڑے

شہر، بڑے وسائل، فطرت کے ایک عجوبے کے تحت ایک منزل پر تشدد کو ضرور تقویت دیتے ہیں۔ یہ تشدد عام طور پر طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے مگر خود بھی ایک مستقل کشش رکھتا ہے اس لیے یہ بھی کہا گیا ہے کہ چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تشدد کا مقابلہ آسان ہے اور بالآخر دنیا شاید بڑی طاقتوں، بڑے ملکوں، بڑے اور پیچیدہ مشینی اداروں کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے ملکوں، نسبتاً سادہ اداروں اور براہ راست انسانی تعلقات میں نجات کا راستہ ڈھونڈے گی۔ بہرحال اس وقت تو امریکہ میں تشدد ایک حقیقت ہے اور یہ تشدد صرف اس طبقے کی طرف سے نہیں ہوتا جو مظلوم یا ستم رسیدہ ہے بلکہ اس کی جارحیت کے مقابلے میں برسر اقتدار طبقے کا تشدد جو کسی وقت بڑے پیمانے پر سامنے آسکتا ہے اور حکومت کے سارے وسائل استعمال کرسکتا ہے زیادہ خطرناک ہے ان مسائل کا عرفان ہی میرے نزدیک بے معنی اور بے راہ تشدد کی بڑھتی ہوئی مقبولت کو کم کرسکتا ہے، اس لیے امریکی دانشوروں میں سماجی نظام کی خرابیوں کو دور کرنے شہروں کی فضا کو بہتر بنانے، ویت نام کی لڑائی سے دست بردار ہونے اور کالے گورے کی تفریق کو ختم کرنے کا جذبہ شاید امریکہ میں بڑھتے ہوئے تشدد کا خود بخود قابو میں لانے کی صورت نکال دے۔

میں جب امریکہ پہونچا ہوں تو ادبی حلقوں میں ("Hair") کا بہت چرچا تھا اسے مصنفین جیروم ریگنی (Girtome Ragni) اور جیمس راڈو نے امریکی قبائلی محبت کا راک میوزیکل (Rock Musical) کہا ہے، جو لوگ ڈرامے میں صاف ستھری حقیقت نگاری، اور باقاعدہ ترتیب ہونے ایکٹ اور سین، کردار، کشمکش اور ایک خاص خیال کا ارتقا ڈھونڈتے ہیں انہیں اس ڈرامے کو پڑھ کر بڑی الجھن ہوگی، اس کے لیے اول تو راک موسیقی کی دھنوں اور ان کے غیر معمولی تاثر سے ایک حد تک آشنا ہونا ضروری ہے، دوسرے جدید ڈرامے میں جس طرح اداکاروں اور دیکھنے والوں کے درمیان ایک رشتہ قائم کیا گیا ہے اسے ذہن میں رکھنا پڑے گا۔ اس ڈرامے میں پچیس اداکار کام کرتے ہیں، دس خاص کردار ہیں جن میں سے دو ابا اور اماں پینتالیس برس کے ہیں اور بوڑھی نسل کی نمائندگی

کرتے ہیں، باقی سترہ سے پچیس سال تک کی عمر کے ہیں اور موجودہ نسل کی خصوصیات ظاہر کرتے ہیں۔ سب لمبے بال رکھتے ہیں، تمہید میں ڈرامے کا تعارف اس طرح ہوا ہے:

"مارشل میک لوہن آج کی دنیا کو کروی گاؤں (Global Village) کہتا ہے اور آج کا نوجوان اجتماعی قبائلی سرگرمیوں میں مصروف ہے اس لیے (Hair) بھی ایک اجتماعی قبائلی سرگرمی ہے یہ جو کچھ (دنیا میں) ہو رہا ہے اس کی توسیع ہے، ایک مشترک مقصد کے لیے ملنا ایک ایسے طرز زندگی کی تلاش جو نوجوانوں کے لیے معنی رکھتا ہے جوان کی نئی بصیرت کے فروغ کا موقع فراہم کرتا ہے۔ خواہ یہ نئی بصیرت واضح حد بندی رکھتی ہو یا نہ رکھتی ہو (Hair) کا مقصد پرانی نسل کی منزل، ناقابل قبول معیار اور اخلاق کا بدل تلاش کرنا ہے۔ یعنی برسر اقتدار طبقے یا (Establishment) کی منزل، معیار اور اخلاق کا بدل اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ مقصد کبھی پورا ہو گا یا نہیں۔ بہر حال آج جو ہو رہا ہے صرف اس کی اہمیت ہے، قبیلے یا ٹولیاں بن رہی ہیں اپنی زندگی گزارنے کا طریقہ بنا رہی ہیں، اپنے اخلاق اپنی ایڈیالوجی، اپنے لباس، عادات اور نشیلی دواؤں کے استعمال کی وجہ سے قدیم تہذیبوں میں ان کے متوازی قبائلی روحانی کیفیت کے نمونے شرق اور مغرب دونوں میں مل جاتے ہیں۔"

سترہ سے پچیس سال تک کے نوجوانوں جو قبیلہ (Tribe) کہلاتے ہیں ایک ایسی زندگی کے خواہش مند ہیں جو موجودہ زندگی سے بہتر، زیادہ صحت مند، پرامن اور محبت سے لبریز زندگی ہے وہ یہ زندگی بسر بھی کر رہے ہیں اور اس کو اسٹیج پر دکھا کر تماشائیوں کو اس میں شریک بھی کر رہے ہیں اس کھیل میں بیرونی خلا (Outer Space) علم نجوم، زمین اجرام فلکی، سیاروں کے درمیان سفر، تصوف، خاص خاص گانوں کے ذریعہ سے آتے ہیں۔ بیرونی دنیا سے خطرہ، پولیس

کی کٹ پتلیوں، ایف، بی، آئی، سی، آئی، اسے کچھ پراسرار آدمیوں اور ابّا اور امّاں کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے، ڈرامے میں دو ایکٹ ہیں ہر ایکٹ میں تیرہ چودہ گانے ہیں، ہم ایسے ڈرامے کے عادی ہیں جو ادب بھی ہو، یہ ڈرامہ، ادب نہیں، تھیٹر اور اس کے اثرات کو ایک نئے انداز سے پیش کرتا ہے، پلاٹ برائے نام ہے، صرف قبیلہ موجودہ زندگی کے بارے میں اپنے تاثرات کبھی گانوں کے ذریعہ سے، کبھی مکالمے کے ذریعہ سے ظاہر کرتا رہتا ہے، قبیلے کے افراد فوج میں جبری بھرتی کے کارڈ جلاتے ہیں، ویت نام کے خلاف ہیں، برسر اقتدار طبقے کے خلاف ہیں پرانے امریکہ کے گاؤں اور ریڈ انڈین بستیوں کے بعض طریقوں کو اپناتے ہیں، جنس کے متعلق ان کا رویہ بھی عام لوگوں سے مختلف ہے، مگر یہ ڈرامہ سیاسی زیادہ ہے جنسی کم۔ قبیلے کا ایک کورس دیکھئے:

ہم کیا چاہتے ہیں؟

امن

ہم یہ کب چاہتے ہیں؟

ابھی

ہم کیا چاہتے ہیں؟

آزادی

ہم یہ کب چاہتے ہیں؟

ابھی (ص:۳۴)

بعض لوگوں کے نزدیک (Hair) محض ایک عارضی میلان کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی معنویت زیادہ گہری نہیں میرے نزدیک یہ اہم کوشش ہے ڈرامے اور گانے کے ذریعہ تماشائیوں میں موجودہ سماجی نظام کے خلاف جذبات ابھارنے کی اب تماشائی صرف ڈرامہ نہیں دیکھتا وہ ڈرامے میں شریک ہوتا ہے۔

ایک اور ڈرامہ جو اگرچہ چار پانچ سال پہلے لکھا گیا تھا مگر امریکہ میں اب اسے کامیابی سے اسٹیج کیا گیا مرات۔ ساد۔ آر۔ تو (Marat / Sade / Artud) ہے یہ

پیٹر وایز نے لکھا ہے، بظاہر یہ نپولین کے زمانے میں ایک پاگل خانے کے مریضوں کے لیے ساد کے ۱۸۰۸ کے ایک کھیل کا نیا روپ ہے، مگر دراصل اس میں انقلاب فرانس پر ساد اور مرات کی بات چیت کے پردے میں جدید تاریخ کی نفسیاتی اور سیاسی بنیادوں پر بحث ہے جس میں نازی دور کے تجربات بھی در آئے ہیں، یہ ڈرامہ ادب بھی ہے، اس میں جا بجا ایسے جملے اور فقرے ملتے ہیں جو ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتے ہیں پھر یہ بہت کامیاب ڈرامہ ہے اور مجموعی طور پر پاگلوں کے ردعمل کے ذریعہ سے زندگی کے اس معمے پر روشنی ڈالی گئی جو بقول فانی نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے پھر آرتو اور بریخت کے ٹکنیک کو یہاں بھی کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے زبان صرف کچھ کہتی نہیں حواس پر چھا بھی جاتی ہے ویسے بریخت اور آرتو کے نقطۂ نظر میں بنیادی فرق ہے یہاں صرف اثر کا ذکر مقصود ہے۔

ینی سوٹا یونیورسٹی میں ایک ایسا علمی کام ہو رہا ہے جس کی ہمارے لیے بڑی اہمیت ہے، وہاں ایک تاریخی اٹلس تیار ہو رہی ہے جو اب تک کی تمام اٹلسوں کے مقابلے میں زیادہ جامع ہے اور جس کے لیے مواد کی تیاری میں جدید ترین معلومات کو ملحوظ رکھا گیا ہے میں جب جنوری ۱۹۷۰ء میں وہاں ایک لکچر دینے گیا تھا تو میں نے ان لوگوں سے بات چیت کی جو یہ عظیم کام کر رہے ہیں اور ان سے اس کے متعلق کچھ معلومات بھی حاصل کیں۔ یہ کام کئی سال سے ہو رہا ہے اور ابھی اس میں کئی سال اور لگیں گے مگر اس وقت تک جو نقشے اور چارٹ تیار ہو چکے ہیں ان کی تعداد بھی خاصی ہے اس کام کو دیکھ کر مجھے بڑا رشک ہوا۔ یہ ہمارے ملک میں ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارے یہاں اچھے مورخوں کی کمی نہیں ہے۔ وسائل بھی بہر حال فراہم ہو جاتے ہیں گو ظاہر ہے کہ مغربی دنیا خصوصاً امریکہ کے وسائل ہمارے بس کی بات نہیں مگر بات صرف وسائل کی نہیں ولولے کی بھی ہے اور پھر ریاض اور یکسوئی سے علمی کاموں میں لگے رہنے کی۔ اس کی ہمارے یہاں جو کمی ہے وہ افسوسناک ہے۔

سارے اٹلس میں ۱۵۳ صفحے ہوں گے ہر صفحے پر متعدد نقشے اور چارٹ ہوں گے

اٹیلس کے بارہ حصے میں طبعی معلومات ہیں اس میں جائے وقوع اور رقبے، موسمیات، آب وہوا، نباتاتی معلومات، جنگلات، پہاڑوں، دریاؤں، وادیوں کے متعلق نقشے ہیں ان میں سے بیشتر کے نقشے تیار ہو چکے ہیں، کچھ کے تیار ہو رہے ہیں، دوسرے حصے میں قبل تاریخ اور ابتدائی تاریخ (Pre and Proto History) سے متعلق نقشے ہیں جن میں پتھر کے عہد سے لے کر ہڑپا کی تہذیب کے نقوش تک کا جائزہ ہے۔ اور اس طرح ویدوں کے دور سے پہلے تک کی ساری معلومات جمع کر دی گئی ہیں اس حصے کے متعدد نقشے تیار ہیں مگر بیشتر بن رہے ہیں مواد جمع ہو چکا ہے، تیسرا حصہ ویدک دور اور کلاسیکل دور کا احاطہ کرتا ہے، اس کے چار ذیلی حصے ہیں، پہلے میں ان تمام مقامات اور آبادیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا ذکر رگ وید اور بعد کے ویدوں میں ملتا ہے یا رامائن اور مہابھارت میں آیا ہے۔ دوسرے میں قبل موریا اور موریا دور کے متعلق معلومات ہیں، تیسرے میں موریا عہد کے بعد کے دور کی سیاسی صورت حال دکھائی گئی ہے چوتھے ذیلی حصے میں گپتا سامراج اور کلاسیکل دور کے متعلق نقشے ہیں۔ اس حصے کے بھی بیشتر نقشے بن چکے ہیں یا بن رہے ہیں، ایک تہائی حصے کا مواد جمع ہو رہا ہے، چوتھے حصے میں آٹھویں صدی سے بارہویں صدی تک کی سلطنتوں اور علاقائی تہذیبوں کے متعلق نقشے ہیں۔ اس حصے میں مذہبی اور فنی اہمیت رکھنے والے مقامات کی نشاندہی خاص طور سے اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً شنکراچاریہ اور رامانج نے جہاں جہاں کا سفر کیا ان تمام مقامات کے نقشے میں صراحت کی گئی ہے، بھگتی تحریک کے فروغ کو بھی اس طرح ظاہر کیا گیا ہے اس حصے کا مواد ابھی زیادہ تر جمع ہو رہا ہے لیکن کچھ چیزوں کے نقشے بھی بن رہے ہیں۔ پانچویں میں مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر مغل حکومت سے قبل تک کی تاریخ کے نقشے ہیں، یہاں بھی مذہبی، فنی، تہذیبی اہمیت کے مقامات کی خاص طور سے نشان دہی کی گئی ہے، صوفیوں کا پرچار، گرونانک، چیتنیہ، ولبھ اچاریہ جن مقامات پر گئے ان کا اندراج ہے، اس حصے کا مواد بھی جمع ہو رہا ہے، ابھی صرف سلاطین دہلی کے متعلق نقشے بن رہے ہیں۔ چھٹے حصے کے پہلے سکشن میں مغل دور کے متعلق تمام معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔ اور دوسرے میں

یورپی طاقتوں کی تجارت اور سواحلی علاقوں میں ان کی فوجی طاقت کے استحکام کا جائزہ لیا گیا ہے، اس حصے کے نقشے بیشتر تیار ہیں اور کچھ کے تیار ہو رہے ہیں مواد قریب قریب سب جمع ہو چکا ہے۔ ساتویں حصے میں ۱۷۰۹ء سے ۱۸۵۷ء تک اقتدار کی کشمکش اور بالآخر برطانوی اقتدار کا قیام دکھایا ہے۔ یہاں بھی دو ذیلی حصے ہیں اور دوسرے حصے میں ۱۸۵۷ء کی شورش کے متعلق ضروری معلومات مہیا کر دی گئی ہیں۔ اس حصے کے سلسلے میں آدھے سے زیادہ نقشے تیار ہیں، بقیہ نصف کے یا تو نقشے تیار ہو رہے ہیں یا مواد جمع ہو رہا ہے، آٹھویں حصے میں جو بہت بڑا ہے، چار ذیلی حصے ہیں۔ پہلے میں آزادی تک کی سیاسی تبدیلیوں کا ذکر ہے دوسرے میں ریاستوں اور صوبوں کے حدود میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کا جائزہ ہے، تیسرے میں ہندوستانی نشاۃ الثانیہ اور بڑے شہروں اور تہذیبی اداروں کی نشان دہی کی گئی ہے، اور چوتھے میں آزادی کی تحریک کے متعلق معلومات ہیں اس حصے میں خصوصاً گاندھی جی کی زندگی میں جو اہم مقامات ہیں، وہ شہر جہاں فسادات ہوئے، کانگریس اور دوسری سیاسی پارٹیوں کے سالانہ جلسے کہاں کہاں ہوئے، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۵ء تک خاص خاص انتخابات، دو عالم گیر جنگوں میں ہندوستانی فوجیں کہاں کہاں لڑیں غرض تمام ضروری معلومات یہاں مل جائیں گی، اس حصے کا نصف مواد نقشوں میں آچکا ہے، باقی کے یا نقشے بن رہے یا مواد جمع ہو رہا ہے، نویں حصے میں آزادی کے بعد کی سیاسی تاریخ ہے، جس میں ضلعوں تک انتظامی منطقے دکھائے ہیں، چار عام انتخابات کے متعلق مواد ہے، سرحدوں کے متعلق تمام مواد یکجا کر دیا ہے، اور دنیا میں جنوبی ایشیا کی جگہ نقشوں میں متعین کی گئی ہے اس حصے میں انتظامیہ اور انتخابات کے چارٹ تیار ہیں دوسری چیزوں کے متعلق ابھی مواد جمع ہو رہا ہے۔ دسویں حصے میں جدید دور میں سماجی اور تہذیبی ارتقا کی نشان دہی ہے۔ اس میں تمام مذہبی فرقوں، ذاتوں، قبیلوں، زبانوں، تہذیبوں، تعلیم اور نشر و اشاعت، پھر دیہات اور شہروں میں تعمیر، لباس، زیورات، جدید فن تعمیر کے متعلق مواد یکجا کیا جا رہا ہے

اس بڑے حصے کے چار ذیلی حصے ہیں اس حصے کے آدھے سے زیادہ نقشے اور چارٹ تیار ہو چکے ہیں اور باقی کے بن رہے ہیں۔ گیارہویں حصے میں آبادی اور اقتصادی حالت کے متعلق معلومات ہیں۔ یہ حصہ بہت اہم ہے کیوں کہ اس میں بڑھتی ہوئی آبادی، شہری آبادی میں اضافہ، زراعت کے متعلق مواد، آبادی کا ملک کے ایک حصے سے دوسرے کو منتقل ہونا، پکی سڑکوں، آب پاشی، زرعی اصلاحات، فصلوں، صنعتوں، خاص صنعتی اداروں سبھی کے متعلق مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس حصے کے نقشے اور چارٹ بھی زیادہ تر تیار ہو گئے ہیں، بارہویں حصے میں تفصیلی مطالعے کے الگ الگ حصوں کے نقشے اور انڈکس نقشے ہیں۔ اس حصے کا مواد بھی جمع ہو رہا ہے، کاش ایسا کام ہندوستان میں ہوتا، مگر بہر حال دنیا میں کہیں اچھا اور بڑا کام ہو ہمیں اس کی قدر کرنی چاہیئے اور ہو سکے تو اس پر اضافہ کرنا چاہیئے۔

امریکہ میں ادبی فضا کے متعلق خاصی غلط فہمیاں ہیں، ہر ملک کی طرح یہاں بھی ادبی کام کئی سطح پر ہوتے ہیں، جو لوگ سب سے مقبول کتابوں (Best Sellers) سے امریکہ کی ادبی فضا کا اندازہ لگاتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ مقبولیت کسی طرح لازمی طور پر ادیب کی دلیل نہیں ہے، ہاں کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ کوئی ادبی کارنامہ مقبول بھی ہوتا ہے مثلاً امریکہ کے اچھے شاعروں میں رابرٹ لادیل اس وقت سب سے ممتاز سمجھا جاتا ہے اس کا تازہ ترین مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا مگر اسے کسی طرح مقبول ترین نہیں کہا جا سکتا گینس برگ (Gins Berg) جو اپنی مشہور نظم چیخ (Howl) کی وجہ سے مشہور ہوا، آج بھی مقبول ہے اور اچھی نظمیں لکھ رہا ہے مگر اسے بھی مقبول ترین نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح رابرٹ بلائی (Robert Bly) اور (Denise Levertor) اور رابرٹ کیلی خاصے ممتاز ہیں اور مقبول بھی لیکن کسی طرح ان کی کتابیں (Best Seller) نہیں ہیں ناول شاعری سے زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اس وقت امریکہ میں ممتاز ناول نگار سال بیلو، فلپ راتھ، جان اپ ڈائک، میری میکارتھی، مالموڈ ہیں۔ ان پانچ میں سے تین یہودی ہیں۔ سال بیلو کے مقابلے میں جو یقیناً ان ناول نگاروں کے مقابلہ میں بہتر فنکار ہے اور زیادہ گہرائی میں جاتا ہے

فلپ راتھ اس وجہ سے بہت مقبول ہوا کہ اس نے اپنی ناول، پورٹ نوائے کا شکوہ، میں ہیرو کی مشت زنی کا تذکرہ خاصی تفصیل سے کیا ہے، مگر دراصل ناول یہودیوں کی نفسیات کے بارے میں ہے، نقادوں نے اسے یہودیوں کے ماحول پر خصوصاً یہودی ماں پر ایک دل کش اور قابل قدر طنز قرار دیا، جان اپ ڈایک کی ناول جوڑے (The Couples) میں نے ہندوستان میں پڑھی تھی اس کے متعلق مجھے حیرت یہ تھی کہ یہ اتنا مقبول کیوں ہوا۔ اس لیے شکاگو میں رچرڈ رسٹرن سے جو انگریزی کے پروفیسر اور خود ایک ممتاز ناول نگار ہیں میں نے اس کی مقبولیت کی وجہ دریافت کی، ناول میں دراصل امریکہ کے ایک خوشحال طبقے میں بیویوں کے تبادلے کا مسئلہ ایک خاص انداز سے لیا گیا ہے اور اس کے اوپر ایک لطیف انداز میں طنز کی گئی ہے مگر اس میں عریانی میرے نزدیک ادبی دائرے سے تجاوز کر گئی ہے، میرے نزدیک عریانی اور فحاشی میں فرق ہے، عریانی اگر ایک سنجیدہ ادبی مقصد کے تحت ہو اور اس میں لذتیت کی آنچ نہ آنے پائے تو میں اسے جائز سمجھتا ہوں، مگر لذتیت مجموعی طور پر ادبی اعتبار سے لائق تحسین نہیں اور فحاشی تو بہر حال قابل اعتراض ہے، اپ ڈایک کے متعلق رسٹرن کی رائے دل چسپ تھی اس نے اپ ڈایک کو مجموعی طور پر سراہا مگر اس ناول کے متعلق مجھ سے اتفاق کیا ہاں اس نے یہ ضرور کہا کہ امریکہ کے ناول نگار موضوع کے مقابلے میں بڑی آزادی برتتے ہیں اور جو موضوع ان کے نزدیک ادبی رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے یا جس سے انسانی نفسیات پر روشنی پڑتی ہے اس کو برتنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں، اس لیے جنسی بے راہ روی، ہم جنسی، مشت زنی، آزار پسندی پر جو ناول اِدھر نکلے ہیں ان پر اسٹرن کو اعتراض نہ تھا، اس کی رائے یہ تھی کہ ان کی ادبی قدر و قیمت صرف مصنف کی نظر، اس کی فنکاری، اس کے زبانوں کے استعمال، اس کی زندگی کے متعلق بصیرت سے ناپی جائے گی، میں نے اسٹرن سے یہ سوال بھی کیا کہ آج امریکہ میں جنس سے اس قدر شغف کی کیا وجہ ہے۔ آخر دوسرے موضوعات بھی تو ہیں، اس کا جواب اس نے دیا کہ امریکہ میں اِدھر فرائڈ کے اثر سے نفسیات پر سب سے زیادہ توجہ ہے، سماجی مسائل بھی ناولوں میں

آجاتے ہیں مگر نفسیات نے ناول کے فن کو متاثر کیا ہے۔ پلاٹ کا وہ تصور جو ایک اچھے قطع کیے ہوئے کپڑے کا ہوتا ہے، پرانا ہوگیا، کردار نگاری بقول میری میکارتھی ختم ہوگئی، ادب کو محض ایک سماجی دستاویز سمجھنے والے کبھی کبھار ابھرتے ہیں مگر مجموعی طور پر امریکہ میں ان کو زیادہ بڑا ادبی درجہ نہیں دیا جاتا۔ ہاں جو لوگ انسانی فطرت، ذہن، شخصیت کے رنگا رنگ پہلوؤں لاشعور کی تہوں، زندگی کے وجودی نظریے پر زور دیتے ہیں وہ زیادہ مقبول ہیں، صرف سیاہ فام لکھنے والے ابھی قدرتی طور پر اپنے مسائل کی عکاسی میں سیدھی سادی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر مجموعی طور پر ان میں بھی رمزیت، اور اس کی بے ترتیبی میں ایک ترتیب اور اس کی بے معنویت میں ایک معنویت زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس رائے سے اختلاف ہوسکتا ہے کیوں کہ ادبی مسائل میں سنجیدہ اختلاف نہ صرف عام ہے بلکہ مستحسن اور صحت مند بھی ہے مگر یہ رائے مجموعی طور پر اہم اور قابل غور ہے، میرے نزدیک امریکی ناول، انگریزی ناول کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے، نہ صرف وہ زندگی کی ساری پہنائیوں کو اسیر کرنا چاہتا ہے بلکہ زبان کے تمام پوشیدہ امکانات سے کام لیتا ہے اور خصوصاً ان حربوں سے جو اب تک شاعری میں استعمال ہوتے تھے اکثر مدد لیتا ہے، امریکہ میں فاکنر کے علاقائی میلان کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، مگر اس کی وہ اہمیت نہیں ہے، ہمنگوے سے اب بھی لوگ خاصے متاثر ہیں خصوصاً اس کے علامتی پہلو اور اس کی زبان کے ڈرامائی پہلو سے۔ مگر اس سے آگے بڑھ کر ناول اب میرے نزدیک ایسی سرحدوں میں داخل ہو رہا ہے جہاں وہ ناول رہتا ہی نہیں موجودہ ذہنی دنیا کے دھندلکے کی ایک ایسی تصویر بن جاتا ہے جس کے نقوش دھندلے اور بے ترتیب ہیں اور انہیں کے ذریعہ سے وہ زندگی کی الجھنوں، ذہن کی بھول بھلیاں اور تصورات و جذبات کی باہم آویزش کا اسیر کرنا چاہتا ہے۔

امریکہ جاتے ہوئے جب کچھ دن مامنیس (مغربی جرمنی) میں ٹھہرا تو وہاں کی یونیورسٹی کے سائکالوجی کے شعبے میں جانے کا اتفاق ہوا، وہاں دیواروں پر میں نے

طلبا کی لگائی ہوئی تحریریں دیکھیں ان میں کچھ مارکس کے اقوال تھے اور کچھ مارکوزے کے، مارکوزے کے نام سے میں واقف تھا مگر یہ اندازہ نہ تھا کہ اس امریکن مصنف اور معلم کے خیالات جرمنی کے طلبا میں بھی اتنے مقبول ہیں امریکہ کے قیام کے زمانے میں کئی استادوں اور طالب علموں سے امریکہ کی مختلف اہم شخصیتوں کے متعلق جب تبادلۂ خیال کیا تو مارکوزے کا نام بار بار آیا۔ مارکوزے (Marcuse) اب ۷۲ برس کا ہوگا۔ جرمنی سے نازیوں کے اقتدار میں آنے کے بعد امریکہ آگیا، کولمبیا، ہارورڈ اور برینڈ سے یونیورسٹی میں ریسرچ کر چکا ہے۔ آج کل کیلی فورنیا یونیورسٹی میں سیاسی فکر کا پروفیسر ہے، اس کی ایک کتاب (Eros and Civilization) "کام دیوتا اور تہذیب" خاصی مشہور ہے۔ جب میں تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کے ایک کورس میں شرکت کر رہا تھا تو پروفیسر ویزیولک بار بار نارمن براؤن کی کتاب زندگی موت کے مقابل (Life against death) اور مارکوزے کی کتاب (Eros and Civilization) کا بار بار حوالہ دیتے تھے۔ ماہر کوزے بائیں بازو کے خیالات رکھتا ہے۔ اس لیے نوجوانوں میں خاصہ مقبول ہے وہ برسر اقتدار طبقے (Establishment) کا سخت مخالف ہے وہ مقابلہ کی اس دیوانگی کے خلاف ہے جو سرمایہ دارانہ نظام میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے وہ اس سرمایہ دارانہ نظام کی میکانکی اور پٹری پر چلنے والی زندگی سے بیزار ہے، اس کے نزدیک آزادی کی فضا پیدا کرنے کے لیے مارکسی نظریہ سے زیادہ گہرائی میں جانا ہوگا۔ اس میں فرد کی ساری خواہشات اور ضروریات کا لحاظ رکھنا ہوگا یعنی (Eros) کو دبانے کے بجائے زیادہ صحت مند جسمانی رشتے قائم کرنے ہوں گے۔ اس کی نئی کتاب (An Eassy on Liberation) میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ سوشلزم پر یقین رکھنے والوں کی بہت سی توانائی سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے پر صرف ہو جاتی ہے یہ توانائی ایک فوجی نظام اور ایک آہنی دفتری نظام کو برقرار رکھنے پر مجبور رہے، اور اس طرح بالآخر امریکی معیار زندگی ان کے لیے ایک ماڈل بن جاتا ہے۔ اس لیے سوشلزم کو اس تھکا دینے والے مقابلے کے بجائے سیاہ فام

اشخاص کی بغاوت اور طلبا کی برہمی سے سبق لے کر، افراد کی زندگی میں آزادی (Liberation) پر زور دینا چاہیئے اور ایک مستقبل تبدیلی کے لیے تیار رہنا چاہیئے تاکہ افراد کی زندگی میں مقابلے کے بجائے تعاون اور بعض جبلتوں کو دبانے کے بجائے ان کا صحت مند اظہار زیادہ اہم ہو۔ مارکوزے آئڈیالوجی کے بجائے آزادی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

امریکہ میں ہنری ملر کی شخصیت پر بھی اکثر بحث ہوتی رہتی ہے کارل سیپرو (Karl Shapiro) نے اسے زندہ مصنفین میں سب سے عظیم قرار دیا ہے سیپرو کے نزدیک وہ لیکھک (Writer) نہیں بلکہ مصنف (Author) ہے۔ سیپرو نے اپنے ایک مضمون میں یہ تجویز کی تھی کہ امریکہ کے ہوٹلوں میں ہر کمرے میں انجیل مقدس کی جو کاپی رکھتی ہے اس کے بجائے ملر کی تحریروں کے اقتباسات پر مشتمل ایک کتاب ہونی چاہیئے، بظاہر ملر کی ناولیں (Tropic of Cancer) اور (Tropic of Capricorn) حد درجہ عریاں ہیں، بلکہ جا بجا فحش، لیکن سیپرو اور لارنس ڈریل اور دوسرے ممتاز ادیبوں کا کہنا ہے کہ ان کے باوجود ملر دراصل بیسویں صدی کا والٹ وھٹمین ہے۔ جارج آرویل، ٹی، ایس، ایلیٹ اور ایزرپا انڈر سب اس کی عظمت کے قائل ہیں، آرویل نے تو یہاں تک کہا تھا کہ ملر مستقبل کے ناول نگار کے لیے رہنما ثابت ہوگا۔ ملر ایک خاص انداز کی شاعرانہ نثر لکھتا ہے، وہ موجودہ میکانکی نظام کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور امریکہ کی روح کو موجودہ شہریت کے قید بند میں دیکھ کر بے چین ہوتا ہے، ملر ایک اختلافی شخصیت ضرور رہے گا جنس کے متعلق اس کے رویے سے سنجیدہ اشخاص کو بجا اختلاف ہوگا مگر اس کی جاندار نثر اور اس کی عام انسان سے گہری محبت، اس کی تحریروں کے خاصے حصے کو قابل قدر بھی قرار دے گی۔

شکاگو میں جنوری کی ایک نہایت سرد رات کو، شام غالب منانے کے بعد کچھ امریکن اور ہندوستانی، ڈاکٹر راما نجن کے یہاں ادبی بات چیت کے لیے جمع ہوئے، اس مجمع میں امریکن شعرا ڈیوڈ رے، ولیم اسٹیفرڈ، ایڈرین رچ، نارمن زانڈ، ان کی بیوی، پاکستانی ادیب اعجاز احمد، ہندوستانی راما نجن، نعیم اور میں تھے،

شروع میں رامانجن نے اپنی انگریزی کی نظمیں سنائیں، رامانجن بڑی نفیس ترشی ہوئی، احساس سے بھرپور نظمیں لکھتے ہیں، ان میں باریک بین نظر، زندگی کے تضادات پر ایک ہلکی سی طنز اور لفظ کی موسیقی سے بھرپور کام لینے کی کوشش ملتی ہے۔ ان نظموں کی سبھی نے دل کھول کر تعریف کی اعجاز احمد نے رامانجن سے سوال کیا کہ تم اپنی مادری زبان میں کیوں نہیں لکھتے، رامانجن نے اعتراف کیا کہ وہ اپنے ہندوستانی ماحول سے ایسے کٹ گئے ہیں کہ اب ان کے لیے کنڑ میں لکھنا مشکل ہے تاہم وہ اس کی کوشش کرتے رہتے ہیں اس پر ان ہندوستانی مصنفین کا ذکر آیا جو انگریزی میں قابل ذکر کام کر رہے ہیں، وسانی کے (The Hatterer) کی بہت تعریف کی گئی راجہ راو اور پی۔ لال کی بھی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا، آر۔ کے نرائن کی شروع کی کاوشوں کو سراہا گیا، ملک راج آنند کا کسی نے نام نہیں لیا۔ پھر رابرٹ لاول کے نئے مجموعے سے ایڈرین ریچ اور اعجاز احمد نے بے اطمینانی کا اظہار کیا اور بات کسی طرح نئے شعرا کی برہمی سے شکاگو سات کے مقدمہ تک پہنچ گئی جس میں گینس برگ نے ایک زور دار بیان دیا تھا۔ ایڈرین صبح کو کچھ دیر مقدمہ کی کارروائی دیکھنے گئی تھیں۔ یہ دبلی پتلی قبول صورت خاتون جو تیس سال کے قریب ہوں گی ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہیں مگر شعر پڑھتی ہیں تو بڑی معصوم اور خوب صورت معلوم ہوتی ہیں، وایس اسٹیفنس اور غالب سے متاثر ہیں۔ یہ نیویارک کے ایک کالج میں انگریزی پڑھاتی ہیں۔ ان سے نظم پڑھانے کے طریقوں پر باتیں ہوئیں۔ لفظ کے جادو کی یہ خاصی قائل ہیں ان کے مقابلے میں اسٹیفرڈ (William Stafford) پچاس کے لگ بھگ متین اور کم گو نکلے۔ نوجوانوں کی ہر تحریک سے جو ہمدردی ظاہر کی جا رہی تھی اس پر انہوں نے ایک دلچسپ جملہ یہ کہا کہ بھائی انصاف کی خاطر کچھ ہم بوڑھوں کا بھی خیال کرو، ڈیوڈ ر سے بار بار میرے اس مضمون کی تعریف کر رہے تھے جو میں نے سہ پہر میں غالب اور جدید ذہن پر پڑھا تھا، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ پال انیگل کے ورک شاپ کے لیے کس اردو کے شاعر یا ناول نگار کو بلایا جائے، تاکہ وہ سال بھر وہاں

رہ کر اپنا تخلیقی کام کر سکے، ہیں نے قرۃ العین حیدر کا نام لیا جب میں نے ان کی ناولوں خصوصًا آگ کا دریا کا تذکرہ کیا تو بہت خوش ہوئے اور انہیں جلد بلانے کا وعدہ کیا لیکن یہ ضرور کہا کہ شاید امسال کسی شاعر کو دعوت دی جائے، اس لیے ممکن ہے بات اگلے سال پر ٹل جائے، نعیم نے میری پر زور تائید کی، نارمن زائلڈ اور ان کی بیوی اپنے ہندوستان کے پچھلے سفر کے تجربات بیان کرتے رہے۔ نارمن بہت کم گو آدمی ہیں لیکن مخلص اور محبت کرنے والے۔ ان کی بیوی کو علی گڑھ خاصہ پسند تھا کیوں کہ وہاں مغربی خواتین کے لیے سوائے گھر میں بیٹھ کر پڑھنے کے کوئی کام نہیں، نہ دہلی کی طرح آرٹ کے اسکول ہیں نہ میوزیم، نہ ایسے گروپ جہاں ہم مذاق خواتین وحضرات جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کر سکیں۔ میں نے کہا بقول مارشل میک لوہن اب تو دنیا ایک عالمی گاؤں (Global Village) ہو گئی ہے، اس عالمی گاؤں میں ایک گاؤں علی گڑھ بھی ہے نیویارک، شکاگو، لاس اینجلس، سان فرانسکو، لندن، بمبی، دہلی جیسے غدار شہروں کے مقابلے میں جو اب ایک طرح انسانوں کے جنگل بن گئے ہیں علی گڑھ جیسا چھوٹا شہر اس لیے غنیمت ہے کہ یہاں شور کم ہوتا ہے، سب ایک دوسرے سے اجنبی نہیں ہیں، لوگوں کی بھاگ دوڑ کم ہے، سڑک اطمینان سے پار کر سکتے ہیں، کچلنے کا خطرہ نہیں، اس پر وہ لوگ ہنسنے لگے، دوسروں نے بھی اعتراف کیا کہ امریکہ میں اب سب سے اچھے شہر وہ ہیں جو چھوٹے ہیں یا بڑے شہروں کے کنارے پر بس گئے ہیں بڑے شہر تو اب جرائم، فضا کی گندگی، سڑک کے حادثوں کی وجہ سے ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔ غرض بڑے شہروں کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کرنے کے بعد کوئی بارہ بجے یہ نشست ختم ہوئی باہر نکلے تو پارہ ۲۰ تھا، بس خدا یاد آ گیا۔

امریکہ کے لوگ خاصے انفرادیت پسند ہیں نوجوانوں کو سکھایا جاتا ہے کہ اپنی صلاحیت پہچانو، اس پر اعتماد کرو اور اس کے لیے تکلیف اٹھانے کو تیار رہو، دنیا جہان کے شکست خوردہ ملکوں (Last Causes) کے علم بردار آپ کو امریکہ میں مل جائیں گے، یونیورسٹیوں میں استادوں کو اکثر ایسے طالب علموں سے سابقہ

پڑتا ہے جو اچھے خاصے پڑھتے پڑھتے، ٹرم پیپر لکھتے لکھتے، استاد سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیالات کرتے کرتے اچانک کہتے ہیں کہ انہیں اس موضوع سے دلچسپی نہیں رہی، اس لیے اب اسے چھوڑ رہے ہیں اور اس پر نہ استاد برہم ہوتا ہے اور نہ والدین، دونوں نوجوانوں کو اپنے شوق کو پورا کرنے، اپنی جنت یا دوزخ بنانے، اپنی منزل دریافت کرنے، اپنے آپ کو پہچاننے کی اہمیت سمجھتے ہیں، اس انفرادیت پرستی کے باوجود امریکہ کے نوجوانوں اور بوڑھوں میں میں نے خاصی سماجی لگن دیکھی، ایک صاحب سے شکاگو میں ملاقات ہوئی یہ فارمن کرسچین کالج لاہور میں برسوں فزکس پڑھاتے رہے، پاکستان اور ہندوستان سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں ان کی بیوی ایک پادری کی بیٹی تھیں۔ ایٹے میں پیدا ہوئیں، اردو اچھی خاصی جانتی ہیں، میاں کی عمر پچاسی سال کی ہوگی، بیوی کی اسّی کے لگ بھگ، دونوں اپنے علاقے کے سماجی کاموں میں حصہ لیتے تھے، بیوی غریب گھرانوں کے لیے کھانے اور کپڑے کا انتظام کرتی تھیں، میاں اپنے علاقے میں فضا کی گندگی کے خلاف مہم چلا رہے تھے، انتخابات میں ایسے امیدواروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے جو کالوں اور گوروں میں تفریق کے خلاف ہوں اور ان کے لیے کام بھی کرتے تھے، ایسے شہریوں کی کمیٹیوں کا روز چرچا سننے میں آتا تھا جو نہ صرف اپنے علاقے کے تمام مسائل پر بحث کرتے تھے بلکہ غیر ملکیوں کے لیے مختلف طرح کے کورس چلاتے تھے، کسی کو انگریزی بولنا سکھایا جا رہا ہے، کسی کو سلائی کی تعلیم دی جا رہی ہے کہیں دنیا کے کسی ملک میں خوف زدہ اور ستم رسیدہ اشخاص کے لیے مالی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس امریکن جوڑے سے میں بہت متاثر ہوا۔ بچے بڑے تھے اور الگ رہتے تھے، ہاں کبھی کبھار ملنے آ جاتے تھے، بچوں کے اور ماں باپ کے خیالات میں خاصہ فرق تھا مگر دونوں میں، میں نے رواداری پائی، جو لوگ ہندوستان ہو آئے ہیں ان کے گھروں میں ہندوستانیوں کے نوادر ضرور ملیں گے، وہ ان ہندوستانیوں سے جن سے ملنا جلنا ہوا ہے، خط و کتابت ضرور کریں گے، عام طور پر ہندوستانیوں کے لیے ان میں ہمدردی کا جذبہ نمایاں ہوگا وہ ہندوستان کی کسی خامی کا ذکر بھی کریں گے تو طنز کے لہجے میں نہیں افسوس کے لہجے

ہیں، یونیورسٹی کے لوگ اپنے مضمون کے علاوہ کوئی ایک دلچسپی (Hobby) بھی رکھتے ہیں خواہ وہ سکّے جمع کرنا ہو یا پتھر جمع کرنا یا پرانے گیت یا مخطوطات یا کسی سلسلے میں معلومات۔ عام آدمیوں میں تو امریکہ کی صنعتی ترقی اور وہاں کے سیاسی نظام، سائنس اور ٹکنالوجی کے کمالات اور شہری زندگی کی آسائشوں پر فخر ملے گا مگر دانشوروں اور معلموں اور نوجوانوں میں دوسروں کے خیالات جاننے، تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے اور سچ کے ان گنت روپ ماننے کا جذبہ بھی نظر آئے گا، یہ لوگ ہر تجربہ کرنے کو تیار ہیں، ہر رنگ کو ایک دفعہ آزمانے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں، ان کے یہاں آزادیٔ فکر کی بنیادی اہمیت ہے طالب علم بے دھڑک پروفیسر سے اختلاف کرتا ہے، پروفیسر خندہ پیشانی سے جواب دیتا ہے، میں نے امریکہ جانے سے پہلے کئی اخباروں اور رسالوں میں پڑھا تھا کہ وہاں کمیونزم سے بڑی نفرت ملتی ہے، اور ایک طرح کا خوف بھی اس نفرت کے پیچھے کام کر رہا ہے، یہ بات بڑے سرمایہ داروں اور برسر اقتدار طبقے کے متعلق صحیح ہے، مگر امریکہ کی یونیورسٹیوں میں استادوں اور طالب علموں کے یہاں مجھے کمیونزم، روس اور چین سے خاصی دلچسپی ملی، اور ایسے لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو بائیں بازو کے خیالات رکھتے ہیں، روس اور چین کے متعلق تحقیق کرنے والوں اور ان ملکوں کی چھوٹی سے چھوٹی بات کا علم رکھنے والوں کی بھی تعداد کم نہیں ہے۔ امریکہ والے ایک زمانے میں اپنی دنیا میں مگن تھے، دوسروں کی انہیں پروا نہ تھی، مگر اب یہ بات نہیں ہے ویسے علیٰحدگی پسند سیاسی حلقے اب بھی ہیں مگر روز بروز ان کا اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس امریکہ میں کچھ عرصے پہلے میکارتھی کے اثر سے سوشلزم اور کمیونزم کا نام لینا بھی جرم تھا اور بہت سے لبرل حضرات کو بے تکلف کمیونسٹ کہہ دیا جاتا تھا، مارکسزم ایک فلسفے کی حیثیت سے امریکہ میں غور سے پڑھا جاتا ہے بعض مارکسی نقادوں مثلاً بنگری کے (Lucaks) کی اہمیت کو مانا جاتا ہے، بریخت (Brecht) کو بیسویں صدی کے عظیم ڈرامہ نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے، گاندھی جی پر حال میں جو کتابیں نکلی ہیں ان میں ایرک ایرکسن (Eric Ericson) کی گاندھی کا سچ (Gandhi's Truth) بڑی اہمیت رکھتی ہے،

اس میں مصنف نے گاندھی جی کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں گہری ہمدردی کے ساتھ بعض باتوں میں اختلاف بھی کیا ہے، ایڈورڈ سیلس (Edward Shils) نے ہندوستانی نوجوانوں کی نفسیات اور ہندوستانی دانشوروں کی ذہنی کیفیت کا گہرا مطالعہ کیا ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ امریکی ذہنی طور پر اپنے خول سے باہر نکل رہا ہے اور حریت فکر اور ایک سماجی شعور کے سہارے، ایک ایسے انقلاب کے لیے تیاری کر رہا ہے جس میں فرد کی آزادی اور ایک بہتر سماج کی تعمیر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں میرے دو لکچر ہوئے ایک اردو ادب کی تاریخ کا ایک نیا نقطۂ نظر کے عنوان سے اور دوسرا غالب اور جدید ذہن پر، ڈاکٹر شمل صدر تھیں۔ پہلے لکچر میں میں نے رام بابو سکسینہ اور صادق دونوں کے اس نظریے سے اختلاف کیا کہ اردو ادب پر فارسی کا اثر اسے بدیسی یا مصنوعی رنگ دیتا ہے، میں نے اس پر زور دیا تھا کہ مقامی زبانوں اور مقامی ماحول کا اثر ابتدائی دور میں بہت نمایاں ہے اور یہ اثر برابر کام کرتا رہا، اور کسی وقت غائب نہیں ہوا، ہاں ادب کی ترقی میں فارسی کا گہرا اثر قدرتی تھا اور بحیثیت مجموعی اس سے اردو ادب کو بہت فائدہ ہوا، اور اس کی رعنائی و زیبائی، گہرائی اور گیرائی میں فارسی کے اثر کا نمایاں حصہ ہے، میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جس طرح سنسکرت قدیم ہندوستان کی کنجی ہے اسی طرح ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان کو سمجھنے کے لیے فارسی کا مطالعہ ناگزیر ہے، بلکہ ہندوستان میں سنسکرت، فارسی، اور انگریزی نے قدیم، درمیانی اور جدید دور میں ہندوستان کی کثرت کو ایک وحدت دینے کی کوشش کی ہے اس پر پروفیسر راجر فرائی جو ہارورڈ میں فارسی کے پروفیسر ہیں بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس بات پر افسوس کیا کہ ان کی یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ہوتے تو اس مسئلے پر اچھی بحث ہوتی، کیوں کہ پروفیسر موصوف کے نزدیک صرف سنسکرت ہی ہندوستان کی کنجی ہے اور فارسی یا انگریزی کے اثرات کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے، میں نے فلاڈلفیا میں بھی بعض پروفیسروں سے یہ شکایت سنی کہ جو لوگ اب تک ہندوستان کی تہذیب اور ہندوستانی ادبیات کے سلسلے میں امریکہ

میں امام رہے ہیں انہوں نے سنسکرت اور قدیم تہذیب پر زیادہ زور دیا ہے، اور جدید ہندوستانی زبانوں مثلاً اردو کو مناسب اہمیت نہیں دی۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں ہندوستانی ادبیات کا مطالعہ سنسکرت سے شروع ہوا اور وہاں کے ماہرین نے اس سلسلہ میں خاصہ کام کیا ہے، مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکہ میں جدید ہندوستان اور اس کے مسائل سے دلچسپی شروع ہوئی تو جلد یہ اندازہ ہوگیا کہ آج کے ہندوستان کو سمجھنے کے لیے جدید ہندوستانی زبانوں کے کماحقہ علم کے بغیر کام نہیں چلے گا، چنانچہ ان زبانوں کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی اور آج ایک یا ایک سے زیادہ جدید زبانوں کی تعلیم کسی نہ کسی امریکی یونیورسٹی میں ہوتی ہے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اردو کی تعلیم یا تو ہندی کے ساتھ یا علیحدہ آٹھ یا نو یونیورسٹیوں میں ہو رہی ہے۔ اردو کی کتابیں اٹھارہ مرکزوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔ جن کے جمع کرنے کے لیے دہلی اور لاہور میں باقاعدہ انتظام ہے دو نسخے لائبریری آف کانگریس میں رکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر ابتدائی اردو اور درمیانی اردو کے کورس ہوتے ہیں۔ ہاں شکاگو اور چند اور یونیورسٹیوں میں ادب کے کورس بھی پڑھائے جاتے ہیں میں نے شکاگو میں نارمن زائڈ سے، ہارورڈ میں ڈبلوسی۔ اسمتھ سے اور مانٹریال میں پروفیسر ایڈمس سے خاص طور پر اس کی سفارش کی کہ یہ لوگ اپنے اثر سے کام لے کر دو یا تین یونیورسٹیوں میں اردو ادب کے باقاعدہ تعلیم کا انتظام کرائیں، میرے نزدیک امریکہ میں شکاگو، ہارورڈ، برکلے اور کناڈا میں میک گل کا ادارہ علوم اسلامیہ یہ کام بخوبی کرسکتا ہے، جیسا کہ حال میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کے ایک مضمون نگار نے امریکہ میں دوسری زبانوں کے تراجم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے، امریکہ کے لوگ عملی قسم کے لوگ ہیں، یورپ والوں کی طرح، انہیں تاریخ، تہذیب، ادب، الفاظ کے جادو، حسن کاری سے اب تک زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ ہاں اب یہ دلچسپی شروع ہوئی ہے، لیکن چوں کہ ان لوگوں کو اپنے علاقائی مطالعے (Area Studies) کے سلسلے میں جدید ہندوستانی زبانیں سکھانے کی ضرورت محسوس ہوئی اس لیے انہوں نے اس کا انتظام کردیا، مگر اس بات کی ضرورت محسوس نہ کی کہ امریکہ میں اردو کے کچھ عالم یا اسکالر

اوراس سے فائدہ بھی ہوا ہے کچھ امریکن طالب علم بھی اردو میں پی ایچ ڈی کی تیاری کر رہے ہیں مگر یہ سلسلہ اور باقاعدہ ہونا چاہیئے، تاکہ اردو کی درس وتدریس کے سلسلے کو مستحکم کیا جاسکے اوراس کے ذریعہ سے امریکہ میں اردو کے اچھے عالم اوراسکالر پیدا کیے جاسکیں۔

امریکہ کی جو یونیورسٹیاں میں نے دیکھیں ان میں طلبا کے اپنے اخبار مجھے بہت پسند آئے۔ یہ اخبار اتنے اچھے ہوتے ہیں اوران میں یونیورسٹی کی سرگرمیوں کے متعلق اتنی معلومات ہوتی ہیں اوران میں ملک کے اہم واقعات، یونیورسٹیوں کی اہم شخصیتوں، طلبا کی جماعتوں اوران کے اہم مطالبات کے متعلق ایسے مضامین ہوتے ہیں کہ انہیں طالب علم اوراستاد سبھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی سے طلبا (Maroon) نکالتے ہیں، یہ تعلیمی سال میں ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا ہے۔ یونیورسٹی اس پرچے کو امداد دیتی ہے، اور کبھی کبھار یونیورسٹی کی طرف سے مواد بھی مہیا کیا جاتا ہے، مثلاً صدر (وائس چانسلر) کی رپورٹ، یونیورسٹی کا بجٹ، یونیورسٹی میں نئے تقررات کے متعلق اطلاعات، مگر اس کے باوجود اخبار میں طلبا کے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین ہوتے ہیں، بلکہ استادوں، نصاب یا کسی خاص کورس کے متعلق آزادانہ اظہارِ خیال بھی ہوتا ہے۔ جس میں لگی لپٹی نہیں رکھی جاتی۔ میں نے خود دیکھا کہ منگل اور جمعہ کو اخبار (Maroon) کی گڈیاں مختلف عمارتوں کے برامدوں میں رکھ دی جاتی تھیں اور عموماً ہر طالب علم یا استاد جو اُدھر سے گزرتا تھا، ایک کاپی لے لیتا تھا، استادوں اور طالب علموں کو یہ اخبار مفت ملتا ہے، باہر والوں کے لیے اسکا چندہ مقرر ہے، اس اخبار میں نئی فلموں، نئے ڈراموں، نئی کتابوں پر جو تبصرے ہوتے ہیں وہ خاصے معیاری ہوتے ہیں، طلبا جو مظاہرے کرتے ہیں ان کے متعلق بھی ساری معلومات اخبار میں درج ہوتی ہیں چوں کہ شکاگو یونیورسٹی بہت بڑی ہے، اور روز وہاں درجنوں اچھے پروگرام کسی نہ کسی شعبے میں ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان کا علم اس اخبار سے ہوسکتا ہے۔ سارے شعبوں کے نوٹس بورڈ پڑھنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں ہے کیوں کہ نوٹس بورڈ پر زیادہ تر اس شعبے یا متعلقہ شعبے کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاع

ایسے پیدا ہوں جو اردو زبان وادب پر پورا عبور رکھتے ہوں، یہ کام بہر حال ضروری ہے، اور تقریباً پندرہ سال سے جدید ہندوستانی زبانوں اردو، ہندی بنگالی، تامل وغیرہ سکھانے کے بعد اب اس بنیاد پر ادب کی تعلیم پر مناسب توجہ کرنی چاہیئے، مجھے خوشی ہے کہ ان حضرات نے میرے خیال سے اتفاق کیا اور اپنے اپنے حلقے میں اس کو منوانے کی کوشش کر رہے ہیں، ہارورڈ میں آسانی یہ ہے کہ ڈرانی فاؤنڈیشن نے ایک گرانقدر عطیہ میرؔ و غالبؔ کے کلام کے ترجمے کے لیے دیا ہے اور اس کی بنیاد پر اردو ادب کی اچھی تعلیم کا انتظام ہو سکتا ہے، شکاگو اور دوسری یونیورسٹیوں میں اگرچہ اس خیال سے ہمدردی ہے مگر فی الحال صدر نکسن کی پالیسی کے تحت ان یونیورسٹیوں کی بہت سی پرانی اسکیمیں بھی ختم کر دی گئی ہیں اور فی الحال نئی اسکیمیں چلانے کا کچھ عرصہ تک سوال نہیں ہے بہر حال اس وقت تو اردو زبان کی تعلیم ایسی ہونی چاہیئے جس سے طلبا میں اردو ادب کے مطالعے کا شوق پیدا ہو نہ کہ صرف تاریخ، یا معاشرہ کے طالب علم ضمنی طور پر کسی ایک زبان سے کچھ واقفیت پیدا کر لیں، اس سلسلے میں ایک اور بات کی طرف اشارہ ضروری ہے جو میں نے کئی جگہ دیکھی، اردو زبان کی تعلیم کے لیے ہر وہ شخص جس کی مادری زبان اردو ہے، موزوں نہیں ہے، اس کے لیے اردو زبان وادب کا کما حقہ علم ضروری ہے، جو اردو میں ایم۔ اے بغیر ممکن نہیں ہے، ہاں امریکہ کے طلبا کو اردو پڑھانے کے لیے لسانیات کا علم بھی ضروری ہے تاکہ جدید تدریس کے طریقوں کے مطابق تعلیم دی جا سکے۔ کئی یونیورسٹیوں میں اردو پڑھانے کے لیے ایسے لوگ بھی مامور کر دیئے گئے ہیں جو اردو زبان وادب سے کما حقہ واقفیت نہیں رکھتے نہ جنہیں اردو زبان سکھانے کا تجربہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ہر انگریز انگریزی نہیں پڑھا سکتا، اسی طرح ہر اردو داں اردو پڑھانے کے لیے بھی موزوں نہیں ہے، اس لیے ایک پروگرام کے تحت ہندوستان اور پاکستان کی یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں سے اساتذہ کو بلانا چاہیئے اور ان اساتذہ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ امریکہ کے اردو کے طالب علموں کو ایسی تربیت دیں کہ ان میں اردو کے عالم اور اسکالر پیدا ہونے لگیں، ویسے اردو کے کچھ اساتذہ اب بھی سال دو سال کے لیے جاتے رہتے ہیں

مل سکتی ہے، اس اخبار کے اشتہارات اور ذاتی کالم بڑے دل چسپ ہوتے ہیں کہیں یہ ہدایت کی جارہی ہے کہ صدر نکسن کو اس مضمون کا تار دیا جائے، کہیں کسی مظاہرے میں شرکت کے لیے اپیل ہے، کہیں کسی تجربے کے لیے کسی استاد نے کچھ معمول طلب کیے ہیں جنہیں معقول اعزازیہ دیا جائے گا کہیں کوئی نوجوان کسی لڑکی سے معنی خیز رشتے (Meaningful Relationship) قائم کرنے کے لیے ملنے کی دعوت دیتا ہے۔ کہیں ٹائپ کرنے کے لیے مدد مانگی جارہی ہے۔ میں نے وسکانسن یونیورسٹی میں۔ منوسوٹا یونیورسٹی میں، ہارورڈ میں، ییل (Yale) میں بھی طلبا کے ایسے ہی اخبار دیکھے، اگر ہماری یونیورسٹیوں سے اس قسم کے اخبار نکلیں تو یقیناً ان کے ذریعہ سے طلبا میں اپنے جذبات و خیالات کے سنجیدہ اظہار کے لیے صلاحیت پیدا ہوگی، طلبا اور اساتذہ ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، انہیں ایک تہذیبی سرگرمی کے ذریعہ سے اپنی شخصیت میں گہرائی پیدا کرنے کا موقع ملے گا، کچھ طلبا کو اس طرح کام ملے گا اور ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور طلبا اور اساتذہ اپنے علاقے کے شہریوں پر بھی اپنے خیالات واضح کرسکیں گے اور شہر اور یونیورسٹی میں ایک رابطہ قائم ہوگا اساتذہ اور طلبا میں ایسے رابطے اور دونوں کے شہریوں سے رابطے کی آج تک ہمارے ملک میں بڑی ضرورت ہے نہ صرف اس طرح نئی نسل کے خیالات عام شہریوں کے سامنے آئیں گے، بلکہ طلبا کو کچھ ذمہ داری کے کام کرنے کا تجربہ ہوگا۔

دوسری چیز جو ان یونیورسٹیوں میں خاص اہمیت کی مالک ہے وہ طلبا کی یونین ہے، جس کی عام طور پر خاصی شاندار عمارت ہوتی ہے۔ جس میں لوگوں کی رہائش کے لیے بھی انتظام ہوتا ہے اور کھانے پینے کے لئے بھی۔ عام طور پر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا یونین کے ریسٹران میں جاکر لنچ کھاتے ہیں۔ دوستوں اور مہمانوں کو بھی یہیں مدعو کیا جاتا ہے۔ اساتذہ کے لیے علیحدہ کلب بھی ہیں مگر طلبا کے کلب کی عمارت میں بھی وہ برابر کسی نہ کسی تقریب کے سلسلے میں یا لنچ کے لیے جاتے ہیں، اس طرح طلبا اور اساتذہ میں خاصہ ربط قائم ہوجاتا ہے۔ اس یونین کی عمارت میں عام طور ایسے بڑے یا چھوٹے کمرے ہوتے ہیں جن میں مختلف قسم کے جلسے ہوتے

رہتے ہیں۔ میڈیسن (وسکانسن) میں میرا غالب کی عظمت پر لکچر یونین کی عمارت میں تھا، اس طرح منوسوٹا یونیورسٹی میں مجھے جو ڈنر دیا گیا تھا وہ وہاں کی یونین میں تھا۔ گویا ان یونیورسٹیوں میں یونین کی عمارت صرف طلبا کا مرکز نہیں ہے بلکہ یونیورسٹی کی زندگی میں ایک مرکزی اہمیت رکھتی ہے ہر یونین عام طور پر خاصی مال دار ہوتی ہے۔ وہ برابر طلبا کی دلچسپی کے لیے مختلف قسم کے پروگرام چلاتی رہتی ہے۔ صرف احتجاجی کارروائی یا مظاہرے کے لیے نہیں ہوتی۔ ہماری سب یونیورسٹیوں میں بھی اگر یونین کو تہذیبی سرگرمی کا مرکز بنایا جائے، اس کی عمارت میں اساتذہ اور طلبا کے لیے پروگرام بنتے رہیں، دوپہر کے کھانے یا کافی کا مناسب انتظام ہو، وہیں سے طلبا کا اخبار شائع ہو، وہیں مختلف قسم کی دلچسپیوں مثلاً اندرونی کھیلوں، ریڈنگ روم کا انتظام یقیناً یونیورسٹی کی زندگی میں زیادہ اہمیت اختیار کرے اور طلبا کی توانائی کو زیادہ تعمیری کاموں میں لگایا جاسکے۔

امریکہ کی یونیورسٹیوں کو دراصل استاد چلاتے ہیں اور ان کے چلانے میں طلبا کا بھی خاصہ حصہ ہوتا ہے میرے نزدیک یونیورسٹی کی زندگی کے ہر شعبے میں استادوں کا اختیار ہونا چاہیئے، ہاں اس میں طلبا کی رائے کو بھی دخل ہونا چاہیئے، ہمارے بہت سے مسائل کا یہی صحیح حل ہے۔

شکاگو بہت بڑا شہر ہے۔ ہمارے لیے نعیم نے شکاگو بیچ ہوٹل میں قیام کا انتظام کیا تھا، یہ ہائڈ پارک کے علاقے میں واقع ہے اور مشی گن کی جھیل سے مشکل سے ایک فرلانگ ہوگا۔ چنانچہ جھیل سے بڑی تیز ہوا برابر آتی رہتی ہے اور جاڑے میں تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بقول سودا، نسیم تیر سی سینے کے پار گزرے ہے میں نے اکتوبر کے آخر میں ہی ایک لمبی اونی ٹوپی خرید لی تھی، جو غالب کی کلاہِ پاپاخ سے ملتی جلتی تھی، سخت ہوا یا سردی ہو تو اس کے اندر کے کونے باہر کر کے کان ڈھک لیا کرتا تھا۔ بیوی ویسے تو خوش تھی، مگر کبھی کبھی ان کے کان میں تکلیف رہتی کبھی پیر میں جس کے لئے برابر دوائیں کھاتی رہتی تھیں ایک دن میں انہیں جھیل کے کنارے لے گیا، میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس جھیل میں جو سمندر معلوم ہوتی تھی (یہ ساڑھے تین سو میل لمبی اور ساٹھ میل چوڑی ہے اور امریکہ کے سینے پر ایک آویزے

کی طرح لٹکی ہوتی ہے) پیر لٹکا کر بیٹھوں، مگر بیوی کو پانی سے ڈر معلوم ہوتا ہے میں نے بہت سے بچوں اور عورتوں اور نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا جو کنارے کی دیوار پر اچھل کود رہے تھے، مگر بیوی کا خوف نہ گیا، چنانچہ اس کے بعد جب بھی گئے تو شریفوں کی طرح ذرا دور دور لئے دیئے رہے مگر ذرا تیز ہوا چلتی تھی تو جھیل کی یاد گھر بیٹھے آجاتی تھی۔

شکاگو میں یاد نہیں پڑتا کہ چاند نظر آیا ہو، کچھ تو شکاگو روشنیوں کا شہر ہے اور رات میں جدھر نکل جاؤ سڑکوں پر تیز سبز روشنی اور عمارتوں کی کھڑکیوں سے چھنتی ہوئی کرنیں دور تک دکھائی دیتی ہیں، کچھ یہ بھی تھا کہ چوں کہ شہر کی فضا عموماً غبار آلود رہتی ہے اس لیے چاند کیسے نظر آتا۔ تاروں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شہر میں اول تو لاکھوں کاروں کے دھوئیں نے پھر سیکڑوں چھوٹے بڑے کارخانوں کی چمنیوں نے فضا کی گندگی کا اچھا خاصہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے جس کے خلاف نوجوانوں اور شہریوں کی کمیٹیاں برابر آواز بلند کرتی رہتی ہیں، اور موسم کے حال کے ساتھ فضا میں گندگی یعنی سلفر آکسائڈ اور کاربن مانو آکسائڈ SO_2 اور CO کو اجزا کا شمار بھی بتایا جاتا ہے۔ شکاگو سے تیس چالیس میل باہر نکل جائیے تو یہ گندگی کم محسوس ہوتی ہے، نعیم ہمیں کئی دفعہ رات کو شہر کی رونق دکھانے لے گئے، ناف شہر یعنی (Daun Town) تو ہر رات کو دن نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مستقل نمائش لگی ہوئی ہے۔ ہاں بڑے دن کے زمانے میں ہر دکان پر پری فانہ کا گمان ہوتا تھا اور ہر دفتر ایک رنگ محل معلوم ہوتا تھا، سائنس کے میوزیم میں، میں نے کوئی بیس ملکوں کے بڑے دن کے پیڑ دیکھے، ہر ایک کی سجاوٹ نرالی تھی، اور ہر ایک کا کرشمہ دامن دل کو کھینچ لیتا تھا۔ مجھے فرانس کے پیڑ کی سجاوٹ خاص طور سے پسند آئی، لیکن شکاگو میں ایسے بھی علاقے دیکھے جہاں لوگ مفلوک الحال معلوم ہوئے اور ہمارے دیار کی طرح سڑکوں پر کھڑے باتوں میں مصروف نظر آئے۔ یہ علاقہ زیادہ تر کالے لوگوں کے تھے، ان میں بہت سے الکہلیت (Alcoholism) کے شکار معلوم ہوتے تھے، یہاں سے دو ایک دفعہ ایسے وقت گزرے کہ رات خاصی جا چکی تھی تو ہمارے خضر راہ چودھری محمد نعیم

ہمیں پہلے سے آگاہ کر دیتے تھے اور گاڑی تیز چلاتے تھے کیوں کہ یہاں کسی کو روک کر اس سے سب کچھ چھین لینا بہت عام بات ہے، بہر حال خدا کا شکر ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا ہاں ایک دفعہ دن دھاڑے ایک بس میں ایک حبشی ملا جو بہت پیئے ہوئے تھا اور جب بس جھٹکے سے چلی اور وہ گر پڑا تو میری بیوی پر گرا، انہوں نے قدرتی طور پر اسے دھکا دیا جس کی وجہ سے وہ فرش پر لڑھک گیا۔ بیوی سے تو وہ نہ الجھا مگر میرے ایک ساتھی جناب شاداں ہندی سے تیز لہجے میں بحث کرتا رہا اور ان کی جیب پر بھی ہاتھ ڈالا مگر اتنے نشے میں تھا کہ شاداں صاحب کا بیان ہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیب پر ہاتھ پھیر رہا ہے اور کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ ہم جیسے محتاط مسافروں کے لیے یہی تجربہ کافی تھا، اور اس کے بعد ہم نے بس میں سفر بہت کم کیا، زیادہ تر کار سے جاتے تھے یا ٹیکسی لے لیتے تھے، یا پھر ریل سے شاپنگ کو جایا کرتے تھے۔

شاپنگ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ضرورت کی کوئی چیز خریدنا ہوتی ہے تو پہلے ٹالتا رہتا ہوں، جب مجبوری سر پر آجاتی ہے تو نکلتا ہوں اور دو چار منٹ میں مطلوبہ چیز لے لیتا ہوں، دوسری عورتوں کی طرح میری بیوی کو شاپنگ سے عشق ہے، وہ دیکھنے کی خاطر بھی بازار جاتی ہیں اور خوب گھوم پھر کر چیز خریدتی ہیں اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اس گھوم پھر کی وجہ سے چیز بھی اچھی ہوتی ہے، مگر کئی گھنٹے دکان کا چکر لگانے کے لیے اتنا وقت اور اتنا صبر کوئی کہاں سے لائے؟ نعیم میری طرح ہیں، وہ ایک چیز دیکھیں اور پسند کی چیز خرید لی۔ اس لیے میری بیوی فخری صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ جانا زیادہ پسند کرتی تھیں۔ فخری شکاگو کے ایک کالج میں تعلیم کے استاد ہیں، ان کی بیگم بھی شاپنگ سے خاصہ شغف رکھتی ہیں، فخری صاحب سنجیدہ سا چہرہ بنائے کوئی نہ کوئی فقرہ چست کرتے رہتے تھے۔ جس کا وار ان کی بیگم پر ہوتا تھا، مگر وہ نہایت خضوع خشوع سے شاپنگ میں مصروف رہتی تھیں یا تو تھک جاتا تھا یا کافی کے بہانے انٹرول کا اعلان کرتا تھا۔

شکاگو میں ہندوستانی اور پاکستانی سب بڑی محبت سے پیش آئے امریکن تو ویسے ہی خاصے گرم جوش ہوتے ہیں۔ شاعر ولیم بلنٹ اور ان کی بیوی مارجوری سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی، مگر ایسے مزے کی باتیں ہوئیں کہ معلوم ہوتا تھا ہم لوگ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ ہمارے دفتر میں جو سکریٹری تھیں ان کا نام جوڈی تھا، ویسے یہ نام امریکہ میں بہت عام ہے، انہیں میری طرح زکام کی شکایت رہتی تھی اور بال پن کے بجائے فاؤنٹین پن سے لکھنا پسند کرتی تھیں میں ایک دفعہ دفتر میں روشنائی مانگنے گیا تو بہت خوش ہوگئیں اور پھر ان سے دوستی ہوگئی یہ مجھے بہت سے ہندوستانیوں سے زیادہ ہندوستانی نظر آئیں، چلتے وقت ملنے آئیں تو بے تکلف بغل گیر ہوئیں اور دائیں گال پر بوسہ دیا۔ یہی عمل کچھ دیر بعد دوسری سکریٹری باربرا نے دہرایا۔ معلوم ہوا کہ بے تکلفی میں یہ معصوم اظہار عام ہے میڈیسن میں جوزف ریڈگر اور پروفیسر رابنن اس طرح ملے جیسے برسوں سے جانتے ہوں۔ کینٹ ول اسمتھ سے تو خیر پہلے سے ملاقات تھی۔ مگر پروفیسر شمل سے جب میں نے بوسٹن کی عظمت کا تذکرہ کیا تو کہنے لگیں سر رضا جب آئیے معاملہ ہو جائے۔ نیو انگلینڈ کا سارا علاقہ آپ کے حوالے آپ قطب مینار ہمیں دے دیجیے۔ میرا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور میں نے کہا یہ سودا مہنگا ہے، پروفیسر شمل بڑی دلکش شخصیت کی مالک ہیں انہوں نے مجھے بڑا اچھا کھانا کلب میں کھلایا اور گھر پر بڑی اچھی چائے پلائی، اس چائے اور چائے پر باتوں کا مزا اب تک یاد ہے اور ان کا رسالہ فکر و فن جو عروس جمیل و لباس حریر کے مصداق ہے فلاڈیفیا میں ماریس ڈیمو، میرے میزبانوں میں تھے چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ کھانا کھاؤں۔ اس کا وقت نہ نکال سکا مگر ان کا اردو ادب سے شغف دیکھ کر جی خوش ہوا، اردو کے پروانے امریکہ میں بھی مل جاتے ہیں یہ ع گرفتہ چینیان احرام و مکی خفتہ در بطحا، والی بات ہے۔

امریکہ کا نظام

امریکہ کے نظام میں کتنی ہی خرابیاں کیوں نہ ہوں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہاں فکر پر کوئی پابندی نہیں وہاں کے اخبار اور رسالے پڑھیے، وہاں کی کتابوں کا مطالعہ کیجیے، وہاں کے دانشوروں طلبا اور اساتذہ سے تبادلۂ خیال کیجیے تو یہ لوگ نہایت فراخ دلی سے اپنے سماج کی خامیوں کا اعتراف کرتے ہیں اگر کوئی شخص ان لوگوں کی برہمی اور بیزاری ہی کو دیکھے تو شاید وہ امریکہ کو جہنم سے بدتر ہی سمجھے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہاں جنت اور جہنم دونوں نظر آتے ہیں بلکہ وہاں کے دانشوروں کی برہمی کا سبب ہی یہ ہے کہ وہ اس جنت اور جہنم دونوں کا راز سمجھ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جہنم کو جلد سے جلد ختم کیا جائے اور جنت کو عام کیا جائے۔ وہاں کے اخباروں میں نیویارک ٹائمس کو اسیسر واگنسو نائب صدر نے کمیونسٹوں کا آلہ کار کہہ ہی دیا تھا۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک لبرل پرچہ ہے اس کے کچھ کارکنوں نے کئی سال ہوئے نیویارک ریویو آف بکس کے نام سے ایک پندرہ روزہ ادبی اخبار نکالا جو اب اپنے معیار کے اعتبار سے انگریزی کے چند چوٹی کے ادبی پرچوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کے مضمون نگاروں میں یورپ اور امریکہ کے ذہن کے بہترین نمائندے اکثر نظر آتے ہیں۔ اس کی ۱۱ر فروری ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ٹام وکر (Tom Wicker) کی ایک تقریر شائع ہوئی ہے جو اس نے نیویارک کی ڈیماکریٹک پارٹی کے ایک جلسے میں ۱۲ر جنوری کو کی تھی۔ ٹام وکر نیویارک ٹائمس کے ادارتی حلقے سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے کینیڈی اور جانسن پر قابل قدر کتابیں لکھی ہیں یہ تقریر "ہماری سیاست" کے عنوان سے

ہے اور اس میں ۱۹۷۰ء کے امریکی انتخابات کے نتائج پر غور کرتے ہوئے ۱۹۷۲ء کے صدر کے انتخاب کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ وکر کا خیال ہے کہ نکسن سے جو عام بیزاری ہے اس کی روشنی میں اس کا دوبارہ منتخب ہونا بہت مشکل ہے اور ڈیماکریٹک پارٹی کے لیے فضا ساز گار ہے بشرطیکہ وہ صدارت کے لیے ایسا امیدوار کھڑا کرے جو امریکہ کی سیاست کی گاڑی کو پرانے ڈھرّے پر چلانے کے بجائے موجودہ مسائل کا کوئی حل نکالے۔ جن مسائل کا اس نے ذکر کیا ہے ان میں ویٹ نام کے دلدل سے رہائی، کالوں کے ساتھ بے انصافی کو دور کرنا، یونیورسٹی کی تعلیم میں ایسی اصلاح کرنا کہ وہ موجودہ نسل کے لیے معنی خیز ہو سکے اور فضا کی گندگی کو ختم کرنا ہیں۔ اس کی تقریر کے ایک حصے کا ترجمہ میں یہاں اس لیے دے رہا ہوں کہ اس کے میلانِ فکر کا اچھا خاصہ اندازہ ہو جاتا ہے

"مفلس ترین کالے آدمی سے لے کر زیادہ دولت مند سفید فام شخص تک اور نیچ کے سب لوگوں کو بھی، عام خلش یہ ہے کہ امریکی زندگی شکست سے دوچار ہے۔ اپنی کارکردگی کھوتی جا رہی ہے۔ بڑے بڑے دعووں اور دولت کے باوجود کام نہیں چل رہا ہے۔

کام کیوں نہیں چل رہا ہے؟ میں اس کے سارے اسباب سے واقف نہیں لیکن شاید میں چند اسباب بیان کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں، ایک وجہ یہ ہے کہ تبدیلی کی رفتار گولی کی رفتار ہو گئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے ان پچیس سالوں میں ٹکنالوجی کی وجہ سے اس ملک کی ایسی رفتار بڑھی ہے جو ڈیٹرایٹ میں بننے والی کاروں کی رفتار سے زیادہ تیز ہے۔ اور جس زمانے میں یہ سب ہو رہا ہے ہمارے سارے ادارے بوڑھے ہو گئے ہیں ان کی رگوں میں سختی آ گئی ہے اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ میرے نزدیک ان اداروں میں سے چار ایسے ہیں جن کی خاص اہمیت ہے۔ ایک بیوروکریسی (دفتر شاہی، فیڈرل، ریاستی اور مقامی) دوسری مزدوروں کی یونیں،

تیسری کارپوریشن، چھوتھے سیاسی جماعتیں، یہ سب عمر رسیدہ ہیں، اپنی حفاظت کے لیے حصار بند ہیں تبدیلی کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں اور انہیں کی وجہ سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمیں ان سے نپٹنا ہے۔

میں یہ صاف کہنا چاہتا ہوں کہ امریکہ کو بچانے کے لیے اعتدال پسندی لازمی طور پر کوئی خوبی نہیں ہے اور انتہا پسندی لازمی طور پر کوئی خامی نہیں ہے۔"

ٹام وکر کے نزدیک سینٹر مکی جس کا نام اس وقت ڈیماکریٹک پارٹی کی طرف سے صدارت کے لیے لیا جا رہا ہے، پارٹی میں بیچ کی پوزیشن رکھتا ہے اور ملک کو ایک ایسے صدر کی ضرورت ہے جو ڈیماکریٹک پارٹی کو واضح طور پر بائیں کو لے جائے تاکہ ان چار طاقتور اداروں کی اپنے آپ کو مضبوط کرنے اور ملک کی تبدیلی کو روکنے کی طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔

ہمارے یہاں بھی تبدیلی کے لیے فضا سازگار ہے۔ یہ تبدیلی ضروری ہے اس تبدیلی کو پرامن طریقے پر لانے کے لیے ملک نے اندرا گاندھی کی کانگریس کو اتنی بھاری اکثریت سے لوک سبھا میں بھیجا ہے اس مضبوط مرکز اور اس کی روشن خیال اور بیدار مغز رہنما سے بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سماج کے ڈھانچے میں جو خرابیاں راہ پا گئی ہیں انہیں جلد دور کیا جائے گا اس سلسلہ میں دفتر شاہی کی اصلاح ہمارے نزدیک سب سے زیادہ ضروری ہے آج پوری قوم مثبت اقدامات کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے ان اقدامات میں تاخیر نہ ہونی چاہیئے ان اقتصادی ڈھانچوں میں تبدیلی کے ساتھ تہذیبی تصور میں بھی تبدیلی لانا ہے تاکہ ہماری مشترک تہذیب کے ہر جلوے اور اس کی ہر کرن پر فخر کرنا سبھی کا شعار ہو۔ غریبی کو دور کرنا ہو یا بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا، غذائی پیداوار بڑھانا ہو یا صنعتی ترقی ان کاموں کے ساتھ مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے دلوں سے خوف اور خطرہ دور کرنا ان کے لیے روزگار بہم پہنچانا اور ان کی ترقی کو ملک کی ترقی سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے اس لیے پرانے بیلوں سے نئے کھیت جوتنے کی امید

فضول ہے نئے کام کے لیے نئے قسم کے کارکنوں کی ضرورت پڑے گی۔ جن کا ایمان واقعی جمہوریت سکولرزم اور سوشلزم پر ہو اور جو صرف زبان سے اس کی رٹ لگانا کافی نہ سمجھتے ہوں بلکہ اس کے فروغ کے لیے جی جان کی بازی لگا سکیں۔

تبدیلی کی اس رفتار کو اب کوئی طاقت نہیں روک سکتی یہ پرامن طریقے پر لائی جا سکتی ہے اور لانی چاہیئے لیکن اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر شاید تشدد کو بھی تبدیلی کی خاطر گوارا کرنا پڑے گا۔ جے پرکاش نرائن جیسے گاندھی وادی نے بھی ایک دفعہ اس خیال کا اظہار کیا تھا۔ فطرت کا قانون بھی یہی ہے۔ یہ تشدد کی حمایت نہیں ہے۔ تبدیلی کی اہمیت اور ضرورت پر اصرار ہے۔

امریکہ میں اُردُو

امریکہ میں ادھر ایشیا کے ممالک کا خاصہ گہرا مطالعہ ہو رہا ہے متعدد یونیورسٹیوں میں جنوبی ایشیا کی زبانوں اور تہذیبوں کے مطالعہ کے لیے مرکز قائم ہوئے ہیں چین اور جاپان، جنوبی مشرقی ایشیا، مشرقی وسطیٰ کی تہذیبوں اور زبانوں کے مرکز علیحدہ ہیں جنوبی ایشیا کی زبانوں اور تہذیبوں کے مرکز میں ہندوستان، پاکستان، نیپال اور سیلون پر تحقیق ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان پر کام کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے ہندوستان کی بیشتر اہم زبانوں کی تدریس کا انتظام موجود ہے اور ہندوستانی تہذیب، تاریخ، ہندوستانی فلسفے اور جدید سیاسی اور سماجی میلانات پر پروفیسر کتابیں شائع کرتے ہیں اور طالب علم ریسرچ کرتے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی، امریکہ کی مشہور ممتاز یونیورسٹیوں میں ہے۔ یہاں جنوبی مشرقی ایشیا کی تہذیبوں اور زبانوں کا مرکز بھی ہے اور شعبہ بھی۔ شعبہ قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے کام ہو سکتا ہے۔ زبانوں میں سنسکرت، اردو، ہندی، بنگالی، تامل، تیلگو، مراٹھی، پنجابی کی تدریس کا انتظام ہے۔ میرے زمانۂ قیام میں سنسکرت، اردو، ہندی، بنگالی اور تامل کی تدریس ہو رہی تھی۔ سنسکرت، بنگالی، تامل میں پروفیسر موجود ہیں۔ سنسکرت کے پروفیسر وان بیوٹن ہیں بنگالی کے ایڈورڈ ڈیمک اور تامل کے پروفیسر کامل زوابل، اردو کے استاد چودھری محمد نعیم ہیں، اردو کے تین کورس ہیں، ایک ابتدائی ایک درمیانی اور ایک اعلیٰ، عام طور پر وہ لوگ جو ہندوستانی تاریخ یا ہندوستانی تہذیب یا ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوستان یا جدید ہندوستان کے کسی موضوع پر ریسرچ کرتے ہیں وہ نگراں

کے مشورہ سے اردو کا کورس بھی لیتے ہیں۔ زیادہ تر طلبا ابتدائی اور درمیانی کورس لیتے ہیں مگر کچھ اعلیٰ کورس تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت تک جو اچھے طالب علم سامنے آئے ہیں کارلو کپولا، ڈیوڈ لیلی ویلڈ اور روبرائن سلور جیسے نوجوان ہیں، موخرالذکر غالب پر پی ایچ۔ ڈی کر رہے ہیں۔ شکاگو یونیورسٹی کے علاوہ ہارورڈ یونیورسٹی، وسکانسن، منوسوٹا، کولمبیا، برکلے، کیلی فورینا، ایری زونا میں اردو کی تدریس کا انتظام ہے، اردو یا ہندی کا علیحدہ شعبہ کہیں نہیں ہے۔ جنوبی ایشیا کی تہذیبوں اور زبانوں کے مرکز یا شعبے میں اردو کی تعلیم کا انتظام حسب ضرورت ہو جاتا ہے۔ میں نے وہاں کے لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ دو یا تین یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام کیا جائے، ہارورڈ، شکاگو، اور برکلے میں اس کے امکانات ہیں۔ ایک بہت اچھی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۱ء سے جو بھی کتاب ہندوستان یا پاکستان میں اردو میں شائع ہوئی ہے وہ امریکہ کی اٹھارہ یونیورسٹیوں میں اور لائبریری آف کانگریس میں موجود ہے PL 480 کے تحت یہ انتظام کیا گیا ہے دہلی اور لاہور میں ایسے بڑے دفتر میں جہاں ساری کتابیں فراہم کی جاتی ہیں ہر کتاب کے بیس نسخے خریدے جاتے ہیں۔ اردو کے تمام معیاری رسالے اور اخبار بھی منگائے جاتے ہیں میں نے پاکستان سے شائع ہونے والی وہ ساری کتابیں شکاگو میں دیکھیں جن کا صرف نام سنا تھا اور جو پاکستانی حکومت کے موجودہ احکامات کی وجہ سے ہندوستان میں نہیں مل سکتیں۔ ان میں غالب پر کئی اچھی کتابیں ہیں۔ رسالوں میں شاید ہی کوئی اہم رسالہ ایسا ہو جو وہاں موجود نہ ہو۔ اخباروں میں الجمعیۃ، قومی آواز، جنگ، ڈان، ہماری زبان، صدق جدید سبھی آتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء سے پہلے کی مطبوعات خاص طور سے آرڈر دے کر منگائی جا سکتی ہیں یا ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں یا مائیکرو فلم حاصل کی جا سکتی ہیں چونکہ اچھی بری ہر قسم کی کتابیں جمع ہو جاتی ہیں اس لیے ایک تہائی کے قریب لائبریری میں نہیں رکھی جاتیں بلکہ خارج کر دی جاتی ہیں انہیں بھی ہندوستان اور پاکستان سے آنے والے بڑے شوق سے لے جاتے ہیں۔

ہندوستانی زبانوں سے زیادہ تر دل چسپی ہندوستانی تہذیب اور سماج اور تاریخ سے دل چسپی کی وجہ سے ہے، مگر اعلیٰ حلقوں میں ادبیات سے دل چسپی بھی پائی جاتی

ہے غالب کی وجہ سے اردو ادب سے دلچسپی بڑھی ہے۔ غالب کا امریکہ میں خاصا چرچا ہے۔ کئی یونیورسٹیوں میں غالب کی یاد میں خاص پروگرام ہوئے۔ ایشیا سوسائٹی کے ۱۹۶۹ء کے سالانہ اجلاس میں غالب پر ایک سیشن رکھا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ہڈسن ریویو نے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں امریکن شعرا ایڈرین رچ (Adrienne Rich) اور ولیم سٹیفرڈ (William Stafford) کے غالب کی کچھ غزلوں کے ترجمے، اعجاز احمد کے تعارف کے ساتھ تھے۔ اعجاز احمد نے ان شعرا کے ساتھ کئی یونیورسٹیوں کا دورہ کیا انہوں نے غالب کی غزلیں سنائیں اور ان شعرا نے اپنے ترجمے شکاگو یونیورسٹی میں میں نے غالب اور جدید ذہن پر ایک مقالہ سہ پہر کو پڑھا، شب میں اعجاز احمد نے ایک تقریر کی اور غالب کی غزلیں سنائیں۔ اس کے بعد ایڈرین رچ، ولیم اشفرڈ، ولیم ہفٹ اور ڈیوڈ رے نے اپنے ترجمے سنائے۔ ایشیا سوسائٹی کی طرف سے ان شعرا کے علاوہ ٹامفنر سمنس، ڈبلو ایس۔ مردن، مارک اسٹرینڈ کے تراجم کتابی صورت میں عنقریب شائع ہونے والے ہیں۔ چودھری محمد نعیم اور رکارو کیولا کئی سال سے انگریزی میں 'محفل' کے نام سے ایک رسالہ شائع کر رہے ہیں جس میں اردو ادب سے متعلق مضامین اور اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے تراجم برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حال میں محفل کا غالب نمبر شائع ہوا ہے جس میں رالف رسل کا ایک اچھا مضمون ہے اور رابرٹ بلائی، نارمن زائد، اور چودھری محمد نعیم کے غالب کے تراجم ہیں۔ ایشیا سوسائٹی داؤد رہبر کا غالب کے اردو خطوط کا ترجمہ بھی شائع کر رہی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی نے رالف رسل اور خورشید الاسلام کی غالب پر پہلی جلد شائع کر دی ہے جس میں یادگار غالب سے غالب کے سوانح، دستنبو اور غالب کے خاصی تعداد میں اردو خطوط تاریخی ترتیب سے انگریزی میں منتقل کیے گئے ہیں دوسری جلد میں غالب کی منتخب فارسی اور اردو شاعری کا ترجمہ ہوگا۔ ایڈرین رچ نے کئی غزل نما نظمیں لکھی ہیں جن میں غالب کو یاد کیا ہے، میری امریکن شعرا سے بات ہوئی۔ وہ غالب کی روح سے ایک یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ غالب کے بہت سے اشعار ان کے دل کے تاروں کو چھوتے ہیں۔

کناڈا اگرچہ علیحدہ ملک ہے مگر اس کا ذکر امریکہ کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ مانٹریال

اور ٹورنٹو سے اردو میں دو رسالے نکلتے تھے، ایک بند ہو گیا، مگر صہبا ابھی جاری ہے، اس میں کناڈا میں مقیم ہندوستانی ادیبوں کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان کے ادیبوں کے افکار بھی شائع ہوتے ہیں۔ جا بجا مشاعرے ہوتے ہیں جن میں لوگ بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ اردو سکھانے کے لیے محمد نعیم، عبدالرحمن بارکر، گوپی چند نارنگ، نے قابل قدر کتابیں شائع کی ہیں ان کتابوں کا سلسلہ جاری ہے۔ غالب، ترقی پسند ادب، سرسید، منٹو، بیدی پر ریسرچ بھی ہو رہی ہے۔ امریکہ میں اردو سے دلچسپی برابر بڑھ رہی ہے ایک صاحب نے شکاگو میں مجھ سے بڑے دکھ سے کہا کہ ہو سکتا ہے ہندوستان اور پاکستان میں آج کل جو کشیدگی ہے اس کے پیش نظر ہندوستانیوں کو پاکستان کی کتابیں صرف امریکہ میں ملیں اور انہیں ادبی کام کرنے کے لیے یہاں آنا پڑے۔ PL 480 اچھا ہو یا برا لیکن اس کے طفیل امریکہ میں ہندوستان اور پاکستان کے ادبیات کا بڑا ذخیرہ جمع ہوتا جا رہا ہے۔

شکاگو یونیورسٹی

یہ یونیورسٹی راک فیلر کی مدد سے قائم ہوئی۔ اس کے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے۔ یونیورسٹی کے صدر یعنی وائس چانسلر ہر سال یونیورسٹی کے خسارے کو دور کرنے کے لیے راک فیلر سے چک لے آیا کرتے تھے، ایک دفعہ ان سے پہلے کہلوا دیا گیا کہ راک فیلر خسارے کو دور کرنے کی بات سننا پسند نہ کریں گے صدر صاحب حسب معمول پہنچے ملنے کے بعد صدر نے کہا آئیے ہم لوگ دعا کریں۔ دعا یہ تھی کہ خدا کرے مجھے راک فیلر سے خسارے کو دور کرنے کے لیے روپیہ کی درخواست نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ مطلوبہ رقم بے مانگے مل گئی۔

شکاگو یونیورسٹی امریکہ کی مشہور اور ممتاز یونیورسٹیوں میں سے ہے۔ یوں تو امریکہ میں اٹھ سو سے اوپر یونیورسٹیاں ہوں گی۔ لیکن ایسی یونیورسٹیاں جو بین الاقوامی شہرت رکھتی ہیں پندرہ بیس ہیں ان میں ہارورڈ، ایم۔ آئی۔ ٹی۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا، برکلے، ییل کولمبیا، شکاگو، پرنسٹن، پین سل وینیا، نیوجرسی، منوسوٹا، وسکانسن کے نام لیے جا سکتے ہیں شکاگو یونیورسٹی میں کئی استاد ایسے ہیں جو نوبل انعام پا چکے ہیں۔ چاند کے پتھروں پر خاصی تحقیق یہاں کے لوگوں نے کی ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت پر گاتھک طرز کا اثر ہے، امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں چالیس پچاس ہزار طلبا کی تعداد عام ہے۔ خود شکاگو شہر میں چھ اور یونیورسٹیاں ہیں ان میں الی نوائے یونیورسٹی میں چالیس ہزار طلبا ہیں لیکن شکاگو یونیورسٹی میں طلبا کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ ہوگی کیوں کہ بیشتر گریجویٹ اسکول (آنرس) یا پی ایچ۔ ڈی کے طالب علم ہوتے ہیں ۱۹۶۹ء کے تعلیمی

سال کے آغاز میں یونیورسٹی نے گریجویٹ اسکول میں کوئی نیا داخلہ نہیں لیا، اس پر کوئی ہنگامہ بھی نہیں ہوا۔ جن کو یہاں داخلہ نہیں ملتا وہ شہر کی کسی دوسری یونیورسٹی میں چلے جاتے ہیں۔ اساتذہ کی کمیٹیاں کورس بناتی ہیں۔ وہی طلبا کے معیار کا اندازہ کرتی اور امتحان لیتی ہیں۔ یونیورسٹی میں اساتذہ کے تقرر کی سفارش بھی یہی کرتی ہیں جو عام طور پر اوپر جاکر منظور ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یونیورسٹی کو فیکلٹی چلاتی ہے، یعنی استاد چلاتے ہیں طلبا کی کمیٹیاں مختلف منزلوں پر ہر کام میں شریک ہوتی ہیں۔ طلبا اپنا اخبار نکالتے ہیں جس کا نام (Maroon) ہے۔ یہ اخبار سبھی استاد اور طالب علم پڑھتے ہیں اس میں طلبا ہر موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں سیاسی، تعلیمی، تہذیبی سبھی موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے اہم تقررات اور خاص سرگرمیوں کی رپورٹ ہوتی ہے۔ ایک ہفتے آٹھ تقررات کی خبر تھی۔ چار پروفیسروں اور چار شریک پروفیسروں کی عمر ۲۹ اور ۳۹ کے درمیان، ایسے بہت سے شعبے ہیں جن میں پروفیسروں کی تعداد شریک پروفیسروں یا اسسٹنٹ پروفیسروں سے زیادہ ہے۔ مشہور و معروف اشخاص کو چھوڑ کر جن کا مستقل تقرر شروع سے ہو سکتا ہے۔ عام طور پر تین سال کے لیے پہلے تقرر ہوتا ہے اس عرصہ میں اگر پی۔ ایچ ڈی کر لیا یا کوئی کتاب شائع کر دی تو مستقل کر دیا جائے گا ورنہ تین سال کا اور موقع دیا جا سکتا ہے اس کے بعد اگر کوئی قابل قدر کام نہ ہوا یا پی ایچ ڈی نہیں کیا تو ملازمت ختم ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے کام کی فضا عام ہے۔ یونیورسٹی ہفتے میں پانچ دن کھلتی ہے۔ لوگ صبح نو بجے سے عام طور پر آجاتے ہیں اور شام کے پانچ چھ بجے تک اپنے کمروں میں کام کرتے ہیں۔ کچھ لوگ رات کو پھر آکر کام کرتے ہیں۔ میں جب پہلے دن پہنچا تو مجھے دو چابیاں دی گئیں، ایک میرے کمرے کی دوسری جنوبی ایشیا کے شعبے کی عمارت کی۔ میں نے پوچھا عمارت کی چابی کا میں کیا کروں گا۔ معلوم ہوا کہ رات کو اگر دیر تک کام کرنا ہے تو اس چابی کی مدد سے آزادی سے آجا سکتے ہیں۔ پہلے ہی دن میرے کمرے میں ٹیلیفون موجود تھا، چھ سو ڈالر کی پیشگی رقم کا چک بھی اسی دن دے دیا گیا تاکہ ابتدائی اخراجات کے سلسلے میں پریشانی نہ ہو۔ کورس استاد اپنی مرضی سے بناتا ہے اور اپنے طریقے سے پڑھاتا ہے۔ کچھ لوگ صبح کو اپنا کام کرتے ہیں، شام کو پڑھاتے

ہیں۔ کچھ لوگ ہفتے میں تین دن سارے لکچر رکھ لیتے ہیں باقی دن خالی رکھتے ہیں یونیورسٹی میں نو بجے صبح سے لے کر رات کے نو بجے تک کلاس ہوتے رہتے ہیں طلبا سے جو فیس لی جاتی ہے وہ بہت ہے مگر چوں کہ بہت سے طلبا کو کوئی نہ کوئی وظیفہ مل جاتا ہے اور بہت سے طالب علم پڑھنے کے علاوہ کوئی کام بھی کرتے ہیں اس لیے فیس معاف کرنے یا یونیورسٹی کی طرف سے امداد کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میرے زمانۂ قیام میں سالانہ فیس اکیس سو ڈالر سے بڑھا کر چوبیس سو ڈالر کر دی گئی تھی۔ یعنی تقریباً دو سو ڈالر سے بڑھا کر چوبیس سو ڈالر کر دی گئی تھی۔ یعنی تقریباً دو سو ڈالر ماہوار۔ میں یونیورسٹی کی جس بس میں جاتا تھا اس میں جس طالب علم سے ملاقات ہوئی وہ یا تو شہر میں کوئی کام کرتا تھا یا کسی اسکول میں جز وقتی تعلیم دیتا تھا یا اسے کوئی وظیفہ ملتا تھا۔ طلبا، اور طالبات کا تناسب قریب قریب برابر ہوگا ان میں اچھی خاصی تعداد سیاہ فام طلبا اور طالبات تھے۔ کچھ سیاہ فام اساتذہ بھی ہیں مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ایک سیاہ فام پروفیسر کو بھی دیکھا، ویسے یونیورسٹی پر یہودی اور لبرل خیالات رکھنے والے اساتذہ چھائے ہوئے ہیں۔ شکاگو میں سفید اور سیاہ فام لوگوں کے درمیان تناتنی دیکھی مگر یونیورسٹی میں اس معاملے میں مساوات نظر آئی۔ ایک بات جو میں نے نوٹ کی لباس کے معاملے میں بے پروائی اور بے نیازی تھی۔ استاد ہوں یا طالب علم جسے خوش پوشی اور نفاست کہتے ہیں اس کے زیادہ قابل نہیں۔ سب چلتا ہے، داڑھیاں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ طالب علم یا تو لائبریری میں کتابوں پر نظریں گاڑے دکھائی دیتے ہیں۔ یا چائے خانوں میں پرجوش بحث ومباحثے میں مصروف۔ انہیں دنیا کے ہر مسئلے سے دل چسپی ہے۔ ویٹ نام، سیاہ وسفید کا امتیاز، فضا کا گدلا پن تو خیر خاص دل چسپی کے موضوعات ہیں لیکن عرب، اسرائیل تنازعے، نئی فلموں، نئے ڈراموں، بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کی تدابیر بڑے کارخانوں کا ہوا کو گندہ کرنا، یونیورسٹی کی تعلیم، ثقافتی زندگی، غرض ہر مسئلہ پر پرجوش بحث ہوتی ہے، مضمون لکھے جاتے ہیں، سمینار ہوتے ہیں رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ امریکہ کے طالب علم سیاسی وسماجی مسائل میں بڑی دل چسپی لیتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ شخصی آزادی کے بھی بہت قائل ہیں۔ کوئی سب کو ایک لاٹھی سے

ہانکنے کی کوشش نہیں کرتا کوئی ہرن پر گھاس نہیں لادتا۔

اب تک شکاگو یونیورسٹی کے استاد اور طالب علم آسمان پر رہتے تھے۔ جسے دیکھو اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ دنیا کے مسائل سے دل چسپی ایک علمی و معروضی نقطۂ نظر سے تھی کئی مشہور پروفیسروں کے گرد ایک مقدس ہالہ تھا۔ یہ لوگ ملنے جلنے سے کتراتے تھے۔ عام لکچروں اور جلسوں میں نظر نہ آتے کوئی باہر سے آنے والا ملنا چاہتا تو ٹال دیتے، اب بھی ملنے جلنے کی روایت عام نہیں ہے۔ بہت ہوا تو لنچ پر مل لئے لیکن ادھر ایک بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ طلبا میں سیاسی رجحان بہت بڑھ گیا ہے اور خصوصاً ویت نام میں امریکن فوجوں کی موجودگی کے خلاف جذبہ عام ہے۔ صدر نکسن کی پالیسی کی حمایت کرنے والے شکاگو یونیورسٹی میں ہی نہیں امریکہ کی یونیورسٹیوں میں کم ہی ملیں گے پھر اساتذہ میں بھی بڑا طبقہ حکومت کی پالیسی کے خلاف ہے اور اپنے مضامین میں، ٹی۔ وی کے مباحثوں شعبے میں کچھ ایسے لوگ مل جائیں گے جو اپنی کتابوں یا مضامین کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ انگریزی تنقید میں شکاگو اسکول کا نام برابر آتا ہے اس کے نمائندوں میں ایڈگر اولسن قابل ذکر ہیں۔ مشہور ناولسٹ سال بیلو بھی انگریزی کے شعبے میں ہیں۔ سیاست کے شعبے میں پروفیسر ایڈورڈ شیس۔ فلسفے میں ہنسا آرنٹ کے کارنامے علمی دنیا میں سب پر روشن ہیں میرے قیام کے زمانے میں آرنٹ نے تین بہت اہم لکچر 'فکر' پر دیئے، روز کوئی نہ کوئی لکچر ہوتا رہتا ہے۔ مگر ان لکچروں میں سامعین کی تعداد عام طور پر کم ہی ہوتی ہے، کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا ہے کہ سو ڈیڑھ سو آدمی ہوں ورنہ تیس چالیس آدمی ہوتے ہیں۔ ہمارے جنوبی ایشیا کے شعبے میں عام طور پر منگل کے دن لکچر ہوتا تھا۔ لکچر کا اعلان مطبوعہ اشتہاروں کے ذریعہ سے ایک ہفتے پہلے ہو جاتا تھا۔ لکچر زیادہ سے زیادہ پون گھنٹے کا ہوتا تھا، ہاں اس پر بحث کم سے کم گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضرور ہوتی تھی۔ میں نے شکاگو یونیورسٹی میں کسی کو خطابت کے جوہر دکھاتے نہیں دیکھا۔ لوگ کام کی باتیں کرتے ہیں لکچر بھی پر مغز ہوتے ہیں۔ کلاس میں لکچروں کا طریقہ دیکھنے کے لیے میں نے تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کے موضوع پر ایک پروفیسر کے لکچروں میں شرکت کی۔ کوئی پچیس طلبا ہوتے تھے

پروفیسر نے پہلے سے لکچروں کا خاکہ اور مطالعے کی کتابوں کی فہرست دے دی تھی، طلبا کے پاس مطالعے کی کتابیں ضرور ہوتی تھیں۔ پروفیسر کوئی چالیس پچاس منٹ لکچر دیتا تھا۔ اس کے بعد طلبا اس پر بحث کرتے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹے کی بحث کے بعد پروفیسر مجموعی طور پر موضوع کو آگے بڑھاتا تھا۔ ہر لکچر کے بعد یہ محسوس ہوتا کہ واقعی علم میں اضافہ ہوا ہے۔ طلبا کے سارے سوالات کتاب کے مطالعے کا ثبوت دیتے تھے۔ بعض طالب علم زیادہ بحث کرتے تھے مگر پروفیسر ہمیشہ سب کو موقع دیتا تھا، ہر کوارٹر میں طالب علم ایک رپورٹ لکھتا ہے جس میں اپنے مطالعے کی کتابوں کا جائزہ لیتا ہے اور ایک ٹرم پیپر جس میں تنقیدی صلاحیت کا ثبوت ضروری ہے یعنی اگر طالب علم نے تمام مواد کو سمیٹ کر سلیقے سے پیش کر دیا ہے اور اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی تو اسے + B سے زیادہ نہ ملے گا۔ ہاں اگر اس میں کوئی اپنی فکر یا نئی فکر کا ثبوت ملتا ہے تو اسے بہتر گریڈ مل سکتا ہے۔ لائبریری بہت بڑی ہے اور اس میں دنیا بھر کی کتابیں ہیں اس کے علاوہ شعبوں کی اپنی بھی لائبریریاں ہیں ہر کتاب کا علم مرکزی لائبریری کے کارڈوں سے ہو سکتا ہے۔ کتابیں عام طور سے غیر معینہ مدت کے لیے لی جا سکتی ہیں صرف بعض ریڈنگ روم ایسے ہیں، جن کی کتابیں پندرہ دن یا تین ہفتے کے لیے ملتی ہیں یہ وقت پر واپس نہ ہوں تو جرمانہ ہوتا ہے۔ دو دفعہ میں بھی جرمانہ دے چکا ہوں۔ چلتے وقت کوئی تین سو کتابیں میں نے واپس کیں، یونیورسٹی کا اپنا پریس اور اپنا بک اسٹور ہے اپنی بس سروس ہے بک اسٹور میں کتابوں اور رسالوں کے علاوہ اساتذہ اور طلبا کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی مل جاتی ہیں چوں کہ کتابیں خاصی مہنگی ہوتی ہیں اس لیے ان کے پیپر بیک ایڈیشن کا لوگ انتظار کرتے ہیں۔ یہ ایڈیشن سال بھر کے اندر آجاتے ہیں۔ طلبا کے کامن روم میں سکنڈ ہینڈ کتابیں بھی مل جاتی ہیں طلبا اور اساتذہ سب علاوہ اپنے مضمون کے ایک ہابی (Hobby) سے بھی شوق رکھتے ہیں اور اس میں خاصی مہارت کا ثبوت دیتے ہیں۔ طلبا اور طالبات آزادی سے ملتے ہیں مگر یونیورسٹی میں ہپی (Hippy) کم ہی دکھائی دیئے اکتوبر میں طلبا میں ویت نام کے خلاف خاصہ جوش تھا، وہ

صدر ریوی کے پاس گئے کہ ۱۵ر اکتوبر کو پڑھائی نہ ہو۔ انہوں نے کہا یونیورسٹی تو بند نہیں ہوا کرتی ہاں یہ اساتذہ اور طلبا پر منحصر ہے کہ وہ پڑھائیں گے اور طلبا پڑھیں گے۔ چنانچہ قریب قریب سبھی اساتذہ نے اس دن کے کلاس دوسرے دن کے لیے ملتوی کر دیئے یعنی پڑھائی ہوئی صرف اس دن نہ ہوئی اور بعد کی پڑھائی کا حرج بھی نہ ہوا۔

شکاگو یونیورسٹی مجھے بہت پسند آئی۔ صرف یہ خیال گزرا کہ اساتذہ نے الگ تھلگ رہنے کو ذرا انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ میں نے وسکانسن کے ایک پروفیسر سے پوچھا کہ آپ کا شکاگو یونیورسٹی کے متعلق کیا خیال ہے۔ بولے بہت اچھی یونیورسٹی ہے مگر اس حقیقت کا اظہار وہاں کے لوگوں کو شد و مد سے نہیں کرنا چاہیئے کچھ دوسروں پر بھی چھوڑ دینا چاہیئے۔

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

اقبالیات

کلیاتِ اقبال	صدی ایڈیشن	۷۵/-
اقبال بحیثیت شاعر	رفیع الدین ہاشمی	۷۵/۰۰
اقبال شاعر و مفکر	نورالحسن نقوی	۸۰/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ	نورالحسن نقوی	۳۰/۰۰
شکوہ جوابِ شکوہ مع شرح	علامہ اقبال	۵/۰۰
بانگِ درا (عکسی)	علامہ اقبال	۳۰/۰۰
بالِ جبریل (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/۰۰
ضربِ کلیم (عکسی)	علامہ اقبال	۲۰/۰۰
ارمغانِ حجاز اردو (عکسی)	علامہ اقبال	۱۰/۰۰

غالبیات

دیوانِ غالب	مقدمہ نورالحسن نقوی	۳۵/-
غالب شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	۳۰/۰۰
غالب شاعر اور مکتوب نگار	نورالحسن نقوی	۴۸/-

سرسید

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد	ثریا حسین	۲۰۰/۰۰
مطالعۂ سرسید احمد خاں	عبدالحق	۴۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء	سید عبداللہ	۴۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید	آل احمد سرور	۱۵/۰۰
سرسید ایک تعارف	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۵/۰۰
سرسید اور ان کے کارنامے	پروفیسر نورالحسن نقوی	۵/-

فیض

کلامِ فیض (عکسی)	فیض احمد فیض	۵۰/۰۰
نقشِ فریادی (عکسی)	فیض احمد فیض	۱۰/۰۰
دستِ صبا (عکسی)	فیض احمد فیض	۱۰/۰۰
دستِ تہِ سنگ (عکسی)	فیض احمد فیض	۱۰/۰۰

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خاں	۵۰/۰۰
اردو زبان کی تاریخ	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۰۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۶۰/۰۰
اردو لسانیات	ڈاکٹر شوکت سبزواری	۳۰/۰۰

ادب و تنقید

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمن اعظمی	۷۵/۰۰
کچھ خطبے کچھ مقالے	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
خواب باقی ہیں (خود نوشت)	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
رشید احمد صدیقی کے خطوط	آل احمد سرور	۱۸۰/۰۰
فکرِ روشن	آل احمد سرور	۱۵۰/۰۰
اردو تحریک	آل احمد سرور	۲۰۰/۰۰
جرنیلی سڑک	رضا علی عابدی	۱۰۰/۰۰
شیر دریا	رضا علی عابدی	۱۵۰/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری	پروفیسر نورالحسن نقوی	۴۰/۰۰
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	[illegible]/۰۰
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ	سنبل نگار	۵۰/۰۰
ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری	یعقوب یاور	۱۷۵/۰۰
آل احمد سرور شخصیت اور فن	امتیاز احمد	۱۵۰/۰۰
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ	ام ہانی اشرف	۱۵۰/۰۰
تصویر اجالوں کی (قلمی مرقع)	نورالحسن نقوی	۱۲۰/۰۰
داستان ناول اور افسانہ	دردانہ قاسمی	۴۰/۰۰
اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید	پروین اظہر	۱۰۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ	عظیم الحق جنیدی	۳۰/۰۰
تاریخ ادب اردو	نورالحسن نقوی	۵۰/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی	۵۰/۰۰
اردو ڈراما کی تاریخ و تنقید	عشرت رحمانی	۵۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ	محی الدین قادری زور	۱۸/۰۰
اردو قصیدہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۳۰/۰۰
اردو مرثیہ نگاری	مرتبہ ام ہانی اشرف	۲۵/۰۰
ناول کا فن	مترجم ابوالکلام قاسمی	۲۰/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	عبدالقادر سروری	۲۰/۰۰
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	۵۰/۰۰
فن افسانہ نگاری	وقار عظیم	۴۰/۰۰
نیا افسانہ	وقار عظیم	۴۰/۰۰
داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۵۰/۰۰
اردو کی تین مثنویاں	خان رشید	۲۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں	سلیم عبداللہ	۲۰/۰۰
آئیے اردو سیکھیں	ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ	۱۵/۰۰
موازنۂ انیس و دبیر	مقدمہ ڈاکٹر فضل امام	۳۰/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری	مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی	۳۰/۰۰
امراؤ جان ادا	مقدمہ تمکین کاظمی	۲۵/۰۰
مجموعۂ نظم حالی	مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	۲۰/۰۰
مثنوی گلزار نسیم	مقدمہ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	۱۵/۰۰
مثنوی سحر البیان	مقدمہ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی	۱۵/۰۰
انارکلی	مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/۰۰

سیاسیات

دنیا کی حکومتیں اور ان کا کانسٹی ٹیوشن	محمد ہاشم قدوائی	۷۵/۰۰
اصول سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹکس)		۷۵/۰۰
جمہوریۂ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا)		۴۰/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس)		۳۰/۰۰

متفرق

اصول تعلیم	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۳۵/۰۰
جدید تعلیمی مسائل	ڈاکٹر ضیاء الدین علوی	۴۵/۰۰
تعلیم اور اس کے اصول	محمد شریف خاں	۲۰/۰۰
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول	محمد شریف خاں، آفاق زمانی	۲۵/-
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے	مسرت زمانی	۴۵/۰۰
جدید علم سائنس	زیارت حسین	۲۵/۰۰
رہبر صحت	مسرت زمانی	۲۰/۰۰
رہبر تندرستی	مسرت زمانی	۲۵/۰۰
علم خانہ داری	مسرت زمانی	۳۵/۰۰
بچوں کی تربیت	مسرت زمانی	۲۵/۰۰
گلدستۂ مضامین انشاء پردازی	ڈاکٹر محمد عارف خاں	۳۰/۰۰
تفہیم البلاغت	وہاب اشرفی	۲۰/۰۰
اردو صرف	ڈاکٹر انصار اللہ	۱۲/۰۰
اردو نحو	ڈاکٹر انصار اللہ	۹/۰۰
اردو سکھشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے)		۷/۵۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر	ایم اے رشید	۳۰/۰۰

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول)	قاضی عبدالستار	۶۰/۰۰
شب گزیدہ (ناول)	قاضی عبدالستار	۳۰/۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
آخر شب کے ہمسفر	قرۃ العین حیدر	۱۰۰/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۴۰/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۴۰/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۴۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۴۰/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز	۳۵/۰۰
ضدی (ناولٹ)	عصمت چغتائی	۲۰/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے	مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس	۳۰/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے	مرتبہ محمد طاہر فاروقی	۱۵/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

مطبوعات ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ علی گڑھ

4676

اقبالیات

کلیاتِ اقبال — صدی ایڈیشن — ۷۵/۰۰
اقبال بحیثیت شاعر — رفیع الدین ہاشمی — ۷۵/۰۰
اقبال شاعر و مفکر — نور الحسن نقوی — ۸۰/۰۰
اقبال فن اور فلسفہ — نور الحسن نقوی — ۳۰/۰۰
شکوہ جوابِ شکوہ مع شرح — علامہ اقبال — ۵/۰۰
بانگِ درا (عکسی) — علامہ اقبال — ۳۰/۰۰
بالِ جبریل (عکسی) — علامہ اقبال — ۲۰/۰۰
ضربِ کلیم (عکسی) — علامہ اقبال — ۲۰/۰۰
ارمغانِ حجاز اردو (عکسی) — علامہ اقبال — ۱۰/۰۰

غالبیات

دیوانِ غالب — مقدمہ نور الحسن نقوی — ۲۵/۰۰
غالب شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — ۳۰/۰۰
غالب شاعر اور مکتوب نگار — نور الحسن نقوی — ۱۲/۰۰

سرسید

سرسید احمد خاں اور ان کا عہد — ثریا حسین — ۲۰۰/۰۰
مطالعۂ سرسید احمد خاں — عبد الحق — ۴۰/۰۰
سرسید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ۴۰/۰۰
انتخاب مضامین سرسید — آل احمد سرور — ۱۵/۰۰
سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی — ۵/۰۰
سرسید اور ان کے کارنامے — پروفیسر نور الحسن نقوی — ۱۵/۰۰

فیض

کلامِ فیض (عکسی) — فیض احمد فیض — ۵۰/۰۰
نقشِ فریادی (عکسی) — فیض احمد فیض — ۱۰/۰۰
دستِ صبا (عکسی) — فیض احمد فیض — ۱۰/۰۰
دستِ تہ سنگ (عکسی) — فیض احمد فیض — ۱۰/۰۰

لسانیات

مقدمہ تاریخ زبان اردو — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۵۰/۰۰
اردو زبان کی تاریخ — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۰۰/۰۰
اردو کی لسانی تشکیل — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۶۰/۰۰
اردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ۳۰/۰۰

ادب و تنقید

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک — خلیل الرحمن اعظمی — ۷۵/۰۰
کچھ خطبے کچھ مقالے — آل احمد سرور — ۱۵۰/۰۰
خواب باقی ہیں (خود نوشت) — آل احمد سرور — ۲۰۰/۰۰
رشید احمد صدیقی کے خطوط — آل احمد سرور — ۱۸۰/۰۰
فکرِ روشن — آل احمد سرور — ۱۵۰/۰۰
اردو تحریک — آل احمد سرور — ۲۰۰/۰۰
جرنیلی سڑک — رضا علی عابدی — ۱۰۰/۰۰
شیر دریا — رضا علی عابدی — ۱۵۰/۰۰
فن تنقید اور تنقید نگاری — پروفیسر نور الحسن نقوی — ۳۰/۰۰
اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ — سنبل نگار — ۷۰/۰۰
اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ — سنبل نگار — ۵۰/۰۰
ترقی پسند تحریک اور اردو شاعری — یعقوب یاور — ۱۷۵/۰۰
آل احمد سرور شخصیت اور فن — امتیاز احمد — ۱۵۰/۰۰
اردو قصائد کا سماجیاتی مطالعہ — ام ہانی اشرف — ۱۵۰/۰۰
تصویر اجالوں کی (قلمی مرقع) — نور الحسن نقوی — ۱۲۰/۰۰
داستان ناول اور افسانہ — دردانہ قاسمی — ۳۰/۰۰
اردو میں مختصر افسانہ نگاری کی تنقید — پروین اظہر — ۱۰۰/۰۰
اردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ۳۰/۰۰
تاریخ ادب اردو — نور الحسن نقوی — ۵۰/۰۰
اردو ناول کی تاریخ و تنقید — علی عباس حسینی — ۵۰/۰۰
اردو ڈراما کی تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ۵۰/۰۰
دکنی ادب کی تاریخ — محی الدین قادری زور — ۱۸/۰۰
اردو قصیدہ نگاری — مرتبہ ام ہانی اشرف — ۳۰/۰۰
اردو مرثیہ نگاری — مرتبہ ام ہانی اشرف — ۲۵/۰۰
ناول کا فن — مترجم ابو الکلام قاسمی — ۲۰/۰۰
اردو مثنوی کا ارتقا — عبد القادر سروری — ۲۰/۰۰
اردو تنقید کا ارتقا — عبادت بریلوی — ۵۰/۰۰
فن افسانہ نگاری — وقار عظیم — ۴۰/۰۰
نیا افسانہ — وقار عظیم — ۳۰/۰۰
داستان سے افسانے تک — وقار عظیم — ۵۰/۰۰
اردو کی تین مثنویاں — خان رشید — ۲۰/۰۰
اردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۲۰/۰۰
آیئے اردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۵/۰۰
موازنۂ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۳۰/۰۰
مقدمہ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۳۰/۰۰
امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۲۵/۰۰
مجموعۂ نظمِ حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۲۰/۰۰
مثنوی گلزارِ نسیم — مقدمہ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی — ۱۵/۰۰
مثنوی سحر البیان — مقدمہ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی — ۱۵/۰۰
انار کلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/۰۰

سیاسیات

دنیا کی حکومتیں اور ان کا کانسٹی ٹیوشن — محمد ہاشم ہمدانی — ۷۵/۰۰
اصولِ سیاسیات (پرنسپل آف پالیٹکس) — ۷۵/۰۰
جمہوریہ ہند (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — ۴۰/۰۰
مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) — ۳۰/۰۰

متفرق

اصولِ تعلیم — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۳۵/۰۰
جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۳۵/۰۰
تعلیم اور اس کے اصول — محمد شریف خاں — ۲۰/۰۰
تنظیم مدارس کے بنیادی اصول — محمد شریف خاں، آفاق احمد زمانی — ۲۲/۰۰
تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے — مسرت زمانی — ۳۵/۰۰
جدید علم سائنس — وزارت حسین — ۲۵/۰۰
رہبرِ صحت — مسرت زمانی — ۲۰/۰۰
رہبرِ تندرستی — مسرت زمانی — ۲۵/۰۰
علم خانہ داری — مسرت زمانی — ۳۵/۰۰
بچوں کی تربیت — مسرت زمانی — ۲۵/۰۰
گلدستۂ مضامین و انشا پردازی — ڈاکٹر محمد عارف علی — ۳۰/۰۰
تفہیم البلاغت — وہاب اشرفی — ۲۰/۰۰
اردو صرف — ڈاکٹر انصار اللہ — ۱۲/۰۰
اردو نحو — ڈاکٹر انصار اللہ — ۹/۰۰
اردو ٹھکشک (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) — ۷/۵۰
انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم اے رشید — ۳۰/۰۰

ناول اور افسانے

حضرت جان (ناول) — قاضی عبد الستار — ۶۰/۰۰
شب گزیدہ (ناول) — قاضی عبد الستار — ۲۰/۰۰
چار ناولٹ (ناولٹ) — قرۃ العین حیدر — ۷۵/۰۰
آخر شب کے ہمسفر — قرۃ العین حیدر — ۱۰۰/۰۰
روشنی کی رفتار (افسانے) — قرۃ العین حیدر — ۷۵/۰۰
راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۴۰/۰۰
کرشن چندر اور ان کے افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۴۰/۰۰
ہمارے پسندیدہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۴۰/۰۰
اردو کے تیرہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۴۰/۰۰
منٹو کے نمائندہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۳۵/۰۰
ضدی (ناولٹ) — عصمت چغتائی — ۲۰/۰۰
پریم چند کے نمائندہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس — ۴۰/۰۰
نمائندہ مختصر افسانے — مرتبہ محمد طاہر فاروقی — ۱۵/۰۰

ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲